www.cpsglobal.org
www.mwkhan.com

الرسالہ
Al-Risala

September-October 2025 • Rs. 50

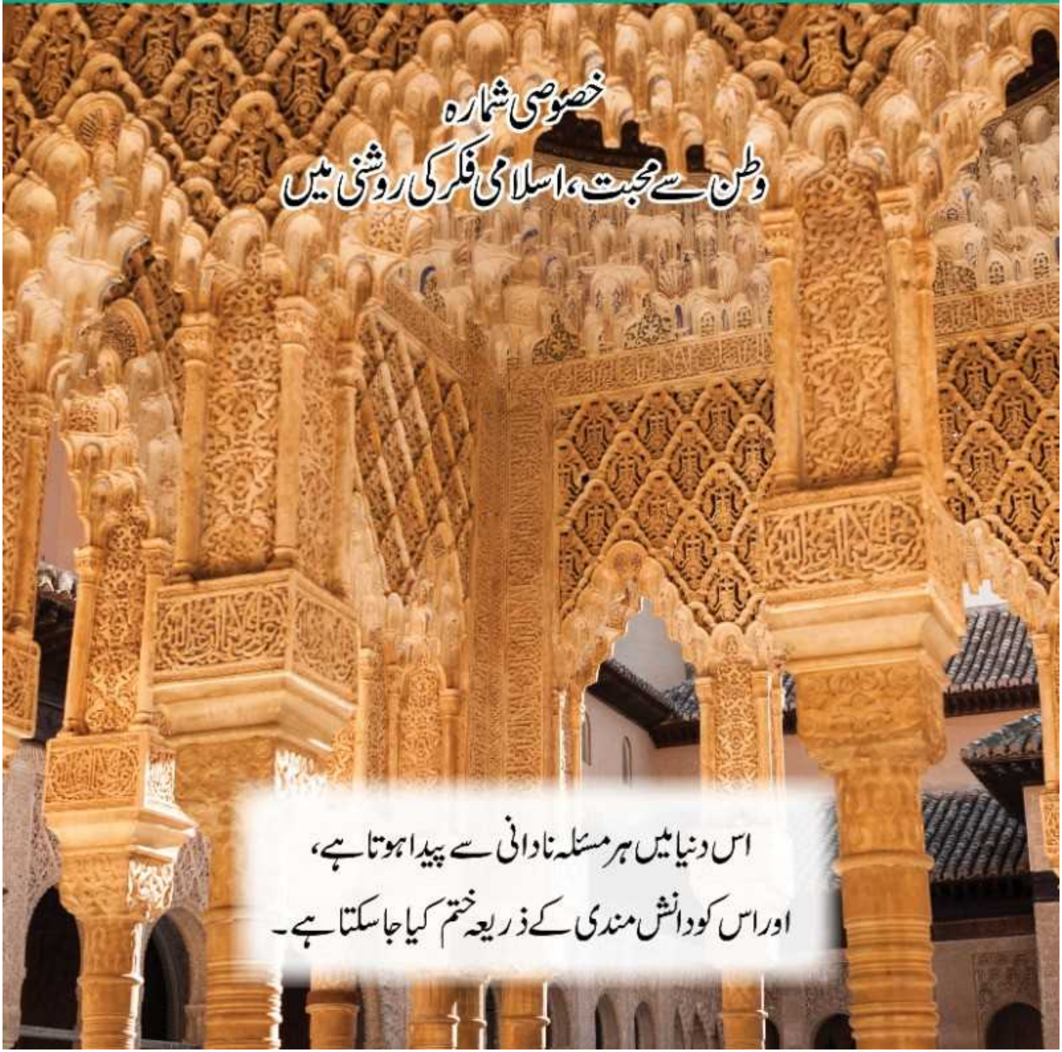

خصوصی شمارہ

وطن سے محبت، اسلامی فکر کی روشنی میں

اس دنیا میں ہر مسئلہ نادانی سے پیدا ہوتا ہے،
اور اس کو دانش مندی کے ذریعہ ختم کیا جا سکتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Sep-Oct 2025 | Volume 50 | Issue 5

Prof. Farida Khanam
Editor-in-Chief

Dr. Stuti Malhotra
Editor (Hindi Section)

Farhad Ahmad
Assistant Editor

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market
New Delhi 110013
Mobile: 8588822679, Tel. 0120 4314871
Email: info@goodwordbooks.com

Annual Subscription Rates

Retail Price	₹ 40 per copy
Subscription by Book Post	₹ 200 per year
Subscription by Regd. Post	₹ 400 per year
Subscription (Abroad)	US $20 per year

Bank Details
Saniyasnain Khan
State Bank of India
A/c No: 30087163574
IFSC Code: SBIN0009109

To order books by
Maulana Wahiduddin Khan
please contact Goodword Books
Tel. 0120 4314871, Mobile: 8588822675
Email: sales@goodwordbooks.com

تحریر

مولانا وحید الدین خاں

فہرست

تمہید 4
وطن سے محبت ایک فطری حقیقت 7
رسول اللہ کی وطن سے محبت 7
نیشنلزم اور حب الوطنی 8
حب الوطنی 10
مسلمانوں کی قومیت 15
ایک غیر حقیقی سوچ 16
قومیت کی بنیاد وطن 17
قوم اور قومیت 18
قومیت کا مسئلہ 21
ہندستانی قومیت 25
مادر وطن کہنا 31
کمیونل ہارمنی 32
حب الوطنی اور قومی یکجہتی 33
گڈ انڈین 34
سچی حب الوطنی 35
احساسِ وطنیت 36
امیر بھارت، غریب امریکا 37
یہ اسلام نہیں 37
ایک مثال 38
برادرانِ وطن کے ساتھ حسنِ سلوک 39
نیشنل کیرکٹر 40
سچی دیش بھکتی 40
قومی شعور اور وطن کی تعمیر 41
اتحاد اور ایثار 42
ایک سینئر سیٹیزن کی زبانی 42
سوال وجواب 46
کفر، تکذیب 49
مٹھاس کا اضافہ 50

नफ़रत का बम 1
नकारासत्मक प्रभाव,सकारात्मक प्रभाव 2
धन पर्याप्त नहीं है 3
भौतिक तरक्की,रुहानी मौत 4
शख़्सियत की तामीर (व्यक्तित्व निर्माण) 4
हक़ीक़त—पसंदाना क़दम,या छलांग 6
भूतकाल में जीना 6
नमाज़ और जीवन का निर्माण 8
क़यामत का भूकंप 9
याद दिलाने वाली मौत 11
मारिफ़त या जानकारी 12
ख़ास योग्यता 14
स्वीकार करने की शर्त 15

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of Al-Markazul Islami, New Delhi
Printed at Tara Art Printers Pvt. Ltd. A46-47, Sector 5, Noida-201301
Published from 1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013 Editor: Saniyasnain Khan

تمہید

وطن سے محبت ایک گہرا انسانی جذبہ ہے — ایسا جذبہ جو سماج، ثقافت اور جغرافیے کی سرحدوں سے بالاتر ہے۔ یہ اس قدرتی رشتے کی عکاسی کرتا ہے جو انسان اور اس سرزمین کے درمیان قائم ہوتا ہے جہاں وہ پیدا ہوتا ہے، پرورش پاتا ہے، اور جہاں اس کی شخصیت تشکیل پاتی ہے۔ اپنائیت کا یہ تعلق صرف زمین سے نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس زمین کی یادوں، زبان، روایات اور اجتماعی تجربے سے جُڑا ہوتا ہے۔ وطن سے محبت محض ایک جذباتی وابستگی نہیں، بلکہ شہری شعور اور اخلاقی بیداری کا مظہر بھی ہے۔

صدیوں سے انسان نے اپنی شناخت، طاقت اور تعلق کا سرچشمہ اپنی جائے پیدائش سے حاصل کیا ہے۔ وطن سے محبت کا مطلب ہے اس کی فلاح و بہبود کا خیال رکھنا، اس کے امن و ترقی کی خواہش رکھنا، اور اس کے مستقبل کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرنا۔ اس محبت میں تنوع کا احترام، ماحول کا تحفظ اور عدل و ہم آہنگی کے لیے جدو جہد شامل ہوتی ہے۔

وطن سے محبت ایک فطری جذبہ ہی نہیں، بلکہ مختلف فلسفیانہ اور مذہبی روایتوں میں اس کی تائید بھی ملتی ہے۔ مسلم علما، فقہا اور صوفیا نے اس کو بھی جائز فطری جذبہ کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ مثال کے طور پر معروف فقیہ ملا علی القاری (وفات 1606ء) نے لکھا ہے: إِنَّ حُبَّ الْوَطَنِ لَا يُنَافِي الْإِيْمَانَ (الأسرار المرفوعة، صفحہ 181)۔ یعنی، وطن سے محبت ایمان کے خلاف نہیں۔

صحیح البخاری کے شارح ابن بطال (وفات 449ھ) لکھتے ہیں: ”اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں وطن سے محبت اور اس کی چاہت رکھ دی ہے — اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا کیا۔ اور آپ کا عمل اس معاملہ میں بہترین نمونہ ہے۔“ (شرح صحیح البخاری، جلد 4، صفحہ 453)

یہ بات درست ہے کہ قرآن و حدیث سے براہ راست طور پر ایسا کوئی حکم نہیں ملتا ہے کہ وطن سے محبت کرنی چاہیے، لیکن بالواسطہ طور پر متعدد حکم ثابت ہیں، جو وطن سے محبت کی اہمیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ امام ذہبی نے اپنی کتاب میں ان چیزوں کی فہرست دی ہے، جن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم محبت کرتے تھے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ اپنے وطن سے محبت کرتے تھے: وَيُحِبُّ وَطَنَهُ (سیر اعلام النبلاء، جلد 15، صفحہ 394)۔

حدیث کی کتابوں میں ایک مسنون دُعا ان الفاظ میں آئی ہے: اَللّٰهُمَّ حَبِّبْ إِلَيْنَا الْمَدِيْنَةَ كَحُبِّنَا مَكَّةَ أَوْ أَشَدَّ (صحیح بخاری، حدیث نمبر 1889؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 1376)۔ یعنی، اے اللہ! ہمیں مدینہ سے اسی طرح محبت دے جیسے تُو نے ہمیں مکہ سے محبت دی ہے۔

اس حدیث میں گویا اس بات کا اشارہ ہے کہ ہر انسان کو اپنی جائے پیدائش اور جائے عمل سے محبت کی دعا کرنی چاہیے۔ اسی طرح حدیث کی کتابوں میں آتا ہے کہ جب آپ سفر سے واپس آتے، اور مدینہ کی دیواروں کو دیکھتے تو مدینہ کی محبت کے تحت (مِنْ حُبِّهَا) اپنی سواری تیز فرما دیتے (صحیح بخاری، حدیث نمبر 1886)۔

صرف وطن سے نہیں، بلکہ وطن سے تعلق رکھنے والی چیزوں سے بھی محبت ہونی چاہیے۔ مثلاً احد کا پہاڑ مدینہ کے لیے قدرتی ڈھال کا کام کرتا تھا، آپ نے اُحد پہاڑ کے لیے فرمایا: هٰذَا جَبَلٌ يُحِبُّنَا وَنُحِبُّهُ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 2889)۔ یعنی، یہ پہاڑ ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ احادیث وطن سے جُڑے گہرے جذبات اور اخلاقی اقدار کو نمایاں کرتی ہیں۔ شارحینِ حدیث نے بھی ان کی اہمیت پر زور دیا ہے اور واضح کیا ہے کہ یہ احادیث وطن سے محبت اور تعلق کو جائز قرار دینے کی دلیل ہیں (عمدۃ القاری للعینی، جلد 10، صفحہ 135؛ فتح الباری لابن حجر، جلد 3، صفحہ 621)۔ برصغیر کے معروف محدث اور فقیہ مولانا زکریا کاندھلوی (1898-1982) نے اس کو مزید واضح کیا ہے کہ "اسی طرح کا حکم مدینہ کے سوا ان تمام شہروں، علاقوں اور وطنوں کے بارے میں بھی ہے جن کی طرف میلان ہو اور جو محبوب ہوں": كَذٰلِكَ الْحُكْمُ فِي غَيْرِ الْمَدِينَةِ مِنَ الدِّيَارِ الْمَرْغُوبَةِ فِيهَا، وَالْأَوْطَانِ الْمَحَبَّبَةِ فِيهَا (اللامع الدراری، جلد 5، صفحہ 279)۔

اسلامی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ یہ سلسلہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ختم ہو گیا، بلکہ بعد میں آنے والے متعدد علما، صوفیا اور شعرا کی تحریروں میں بھی اسی جذبے کی بازگشت ملتی ہے۔ مثلاً اسلامی تاریخ کے مشہور زاہد اور صوفی بزرگ ابراہیم بن ادہم (وفات 160 ہجری) سے منقول ہے:

مَا قَاسَيْتُ فِيمَا تَرَكْتُ شَيْئًا أَشَدَّ عَلَيَّ مِنْ مُفَارَقَةِ الْأَوْطَانِ (حلیۃ الاولیاء، جلد 7، صفحہ 380)۔ یعنی، میں نے جن چیزوں کو چھوڑا، اُن میں سے کسی چیز کی تکلیف مجھ پر اتنی شدید نہ تھی جتنی وطن کی جدائی۔

علامہ راغب اصفہانی پانچویں صدی ہجری (11 ویں صدی عیسوی) کے مشہور مسلم عالم، مفسر اورعربی زبان کے ماہر تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب محاضرات الاُدباء (جلد دوم، صفحہ 652) میں وطن کی محبت کے موضوع پر دو مستقل عناوین قائم کیے ہیں۔ اس کتاب میں وطن سے محبت کے تعلق سے ایک بامعنی قول یہ ہے: حُبُّ الْوَطَنِ مِنْ طِيْبِ الْمَوْلِدِ (وطن کی محبت نیک فطرت انسان کی صفت ہوتی ہے)۔ اسی طرح ایک اور قول یہ ہے: لَوْلَا حُبُّ الْوَطَنِ لَخَرَبَتْ بِلَادُ السُّوءِ (اگر وطن سے محبت کا جذبہ نہ ہوتا تو وہ خطے ویران ہوجاتے، جہاں ظلم و بدعنوانی پائی جاتی ہے)۔

اسلامی لٹریچر میں اس نوعیت کے متعدد دلائل اس حقیقت کی نہایت واضح طور پر نشان دہی کرتے ہیں کہ وطن سے محبت ایک فطری جذبہ ہے، وہ ایمان کے منافی نہیں، بلکہ اخلاقی اقدار کے عین مطابق ہے۔ یہ اقوال اس امر کو اجاگر کرتے ہیں کہ کسی انسان کا اپنے وطن سے محبت کرنا تنگ نظری یا تعصب نہیں، بلکہ انسانی اخلاق اور فطرت کا ایک لازمی جزء ہے۔ یہ خلافِ اخلاق بات ہوگی کہ وہ سرزمین جو آپ کو سب کچھ فراہم کرے، آپ کو اس سے کوئی اُنس یا تعلق نہ ہو۔

سچی حب الوطنی ایک جوڑنے والی قوت ہوتی ہے، پھوٹ ڈالنے والی نہیں۔ یہ دین کے خلاف نہیں، بلکہ اس کی تقویت کا ذریعہ ہے۔ زیر نظر کتابچہ، مولانا وحیدالدین خان کی تحریروں پر مشتمل ہے۔ ان صفحات میں قاری کو وطن سے محبت کا ایک نیا زاویہ دیکھنے کو ملے گا۔ یعنی یہ کہ اخلاص، اخلاق، مثبت طرزِ فکر اور تعمیری سرگرمیوں کے ساتھ وطن سے محبت، ایک بہتر دنیا کی تشکیل کا مؤثر ذریعہ ہے۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ اس کتابچہ کو کامیابی عطا فرمائے، اور مصنف کے لیے صدقہ جاریہ بنائے، آمین۔

ڈاکٹر فریدہ خانم، نئی دہلی

جولائی 2025

وطن سے محبت ایک فطری حقیقت

حضرت عمر فاروق نے ایک بار فرمایا کہ اللہ نے ملکوں کو حب الوطنی کے ذریعہ آباد کررکھا ہے:
عَمَّرَ اللّٰہُ البُلْدَانَ بِحُبِّ الأَوْطَانِ (التذکرۃ لابن حمدون البغدادی، اثر نمبر 407)۔

اس قول میں ایک فطری حقیقت کو بتایا گیا ہے۔ یہ انسان کی فطرت میں شامل ہے کہ اس کو اپنے وطن سے محبت ہو۔ اسی محبت کے زور پر بستیاں اور شہر آباد ہوتے ہیں۔ اب اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ یہ فطرت خود خدا کی پیدا کی ہوئی ہے تو حب وطن بھی ایک ایمانی صفت نظر آئے گی، کیوں کہ ایمان فطرت انسانی ہی کا ایک مظہر ہے۔ "حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الإِيمَانِ" (وطن سے محبت ایمان کا جزء ہے) اگرچہ حدیث رسول نہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس میں جو بات کہی گئی ہے، وہ بذات خود ایک درست بات ہے۔ (ڈائری، 29 فروری 1996)

رسول اللہ کی وطن سے محبت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جب مجبورانہ طور پر مکّہ سے ہجرت کرکے مدینہ جانے لگے تو اُس وقت آپ نے مکّہ کی طرف دیکھ کر فرمایا: وَاللّٰہِ إِنَّكِ، لَخَيْرُ أَرْضِ اللّٰہِ، وَأَحَبُّ أَرْضِ اللّٰہِ إِلَيَّ، وَاللّٰہِ لَوْلَا أَنِّي أُخْرِجْتُ مِنْكِ، مَا خَرَجْتُ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 3108)۔ یعنی، اے مکہ، تو مجھے دنیا بھر میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ مگر تیرے باشندے مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے۔

بعد کو جب مکہ فتح ہوا تو آپ کے لیے پورا موقع تھا کہ آپ مکہ کو دوبارہ اپنی قیام گاہ بنالیں۔ مگر آپ مدینہ واپس چلے گئے اور آخر عمر تک وہیں رہے۔ حتیٰ کہ آپ کی وفات کے بعد مدینہ ہی میں آپ کی قبر بنائی گئی۔

اس سے معلوم ہوا کہ مکہ کے بارے میں آپ کا مذکورہ جملہ شرعی نوعیت کا جملہ نہ تھا۔ اگر اس کی حیثیت شرعی ہوتی تو یقیناً آپ فتح کے بعد مکہ میں رہ جاتے۔ مگر مکہ پر قبضہ کے باوجود آپ کا مدینہ چلے

جانا ثابت کرتا ہے کہ یہ جملہ شرعی نہ تھا، بلکہ وہ وطنی محبت کے جذبہ کے تحت نکلا ہوا ایک جملہ تھا۔ (ڈائری، 12 نومبر 1996)

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ آپ کا یہ ارشاد اس لیے تھا کہ مکّہ ایک مقدس شہر ہے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا یہ ارشاد وطن کے جذبے کے تحت تھا۔ یہ اسی جذبے کا اظہار تھا جو ہر انسان کے اندر اپنے وطن کو چھوڑتے وقت پیدا ہوتا ہے۔ بعد کے زمانے میں مسلمانوں میں نعت گوئی کا رواج ہوا۔ اِن نعتوں میں ہمیشہ مدینہ کی عظمت بیان کی جاتی ہے۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ ان نعتوں میں مکہ کی عظمت بیان کی جاتی ہو۔ اگر مکہ مطلق طور پر مقدس شہر ہوتو ان نعتوں میں مکّہ کی تعریف ہونی چاہیے تھی، نہ کہ مدینہ کی۔ (ڈائری، 14 ستمبر 2006)

نیشنلزم اور حب الوطنی

1971 کے نصف اول کا واقعہ ہے۔ میں نے بذریعہ ٹرین پاکستان (لاہور اور فیصل آباد) کا سفر کیا۔ جب میں ہندستانی سرحد پار کیا اور دوسری جانب پہنچا تو میرے قلی نے ایک فوجی افسر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ میجر صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔ اس کے بعد قلی نے مجھے ایک بند فوجی خیمے کے اندر پہنچا دیا۔ وہاں ایک پاکستانی فوجی افسر بیٹھا ہوا تھا۔ اس خیمے میں صرف ہم دو آدمی تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ بنگلہ دیش کی جنگ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس مسئلہ کی وجہ سے انڈیا اور پاکستان میں سخت تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔

اس خیمہ میں پاکستانی فوج کے افسر نے مجھ سے ایسی گفتگو شروع کی جو میرے نزدیک انڈیا کے نیشنل انٹرسٹ کے خلاف تھی۔ مثلاً باوردی فوجی افسر نے مجھ سے کہا کہ انڈیا کے کچھ فوجی راز بتائیے۔ کچھ دیر تک میں برداشت کرتے ہوئے اس کی باتیں سنتا رہا۔ پھر میں نے کہا میجر صاحب، آپ مجھ سے یہ سمجھ کر بات کیجئے کہ میں انڈیا کا ایک وفادار شہری ہوں۔ اس کے بعد میں نے تقریباً پندرہ منٹ تک نہایت سخت انداز میں اس کے سامنے تقریر کی۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت اگر وہ مجھے

گولی مار دے تو یہاں مجھے کوئی بچانے والا نہ ہوگا۔ مگر صورتِ حال کی نزاکت کی پروا کیے بغیر میں نے اس سے وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو ایک ہندستانی شہری کی حیثیت سے میں کہہ سکتا تھا۔

مذکورہ فوجی میجر سے جو باتیں میں نے کہی، ان میں سے ایک بات یہ تھی اگر انڈیا کے ساتھ آپ کی لڑائی کا انحصار ہمارے جیسے لوگوں سے فوجی راز حاصل کرنے پر ہے تو آپ اپنی لڑائی جیت چکے۔ کیوں کہ موجودہ زمانہ میں جنگی راز اتنا ٹاپ سیکریٹ ہوتا ہے کہ بعض اوقات وزیر دفاع کو بھی اس کی خبر نہیں ہوتی۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک میں اس قسم کی باتیں کرتا رہا۔ اس کے بعد سلام اور معذرت کیے بغیر خیمہ سے باہر نکل آیا۔ مذکورہ میجر مکمل خاموشی کے ساتھ میری باتوں کو سنتا رہا۔ جب میں باہر نکلا تو وہ بھی میرے پیچھے پیچھے باہر آ گیا۔ اس نے کہا: مولانا صاحب، ہم کو آپ ہی جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔

یہ بات میں نے پاکستان کی سرزمین پر ایک فوجی خیمے میں اس وقت کہی جب کہ اگر وہ فوجی افسر مجھے گولی مار دیتا تو شاید میری موت اس طرح واقع ہو جاتی کہ اس کی کوئی خبر بھی نہ بنتی۔

جس وقت میں نے پاکستان کے فوجی افسر سے یہ باتیں کہیں اس وقت میرا مذہب، میرا لباس، میری بولی، میری خاندانی روایات، سب کچھ ایک عام ہندو سے مختلف تھیں۔ مگر قومی احساس کے اعتبار سے اس وقت میرا احساس عین وہی تھا جو ایک دیش بھگت ہندو کا احساس ہو سکتا ہے۔

میری زندگی کے سیکڑوں واقعات میں سے یہ صرف چند واقعات ہیں جو بتاتے ہیں کہ مجھے اپنے وطن سے کتنا زیادہ لگاؤ ہے۔ جو ہندو مجھے قریب سے جانتے ہیں، مثلاً سوامی اوم پورن سوتنترا (نئی دہلی) یا سوامی چیدانند (رشی کیش)، وغیرہ، وہ کہتے ہیں کہ آپ کے اندر جو دیش بھکتی ہے اس کی مثال ہم نے مہاتما گاندھی کے بعد کسی اور کے اندر نہیں دیکھی۔ میرے دل کی یہی تڑپ ہے جو مجھ کو مذکورہ قسم کی باتیں کہنے پر مجبور کرتی ہے۔

اس نوعیت کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ 20 جنوری 1997 کو نئی دہلی میں پانیر ہاؤس میں ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں شہر کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ شریک تھے۔ اس میٹنگ کا موضوع تھا— کیا گاندھی آج کے ہندستان میں کامیاب ہوتے۔ میں نے اس موقع پر ایک لمبی تقریر کی۔ اس

سلسلہ میں میں نے کہا کہ گاندھی پچھلے انڈیا میں بھی کامیاب نہیں ہوئے یہاں تک کہ 1947 میں انھیں خود یہ کہنا پڑا کہ: اب میری کون سنے گا۔ پھر گاندھی جب پچھلے انڈیا میں کامیاب نہیں ہوئے تو آج کے انڈیا میں وہ کس طرح کامیاب ہوتے۔ ایک ہندو پروفیسر نے میری بات سن کر کسی قدر برہمی کے ساتھ کہا کہ آپ مہاتما گاندھی پر تنقید کر رہے ہیں۔ یہ سن کر میرا دل تڑپ اٹھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے درد بھرے لہجے میں کہا:

I love Gandhi, but I love India more than Gandhi

میری یہ بات سن کر پروفیسر صاحب خاموش ہوگئے۔ اس کے بعد کسی نے بھی میری تنقیدی تقریر کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ میری یہ تقریر مکمل طور پر انگریزی اخبار پانیر (نئی دہلی) کے شمارہ 26 جنوری 1997 میں چھپ چکی ہے۔

میری بعض تنقیدوں کو سن کر ایک تعلیم یافتہ ہندو نے کہا کہ آپ ہمارے قومی لیڈروں کی اتنی سخت آلوچنا کرتے ہیں۔ آخر کس نے آپ کو اس کا ادھیکار دیا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میری دیش بھکتی (حب الوطنی) سے مجھ کو یہ ادھیکار پراپت ہوا ہے۔ یہ سن کر وہ چپ ہوگئے۔ (ہند-پاک ڈائری، صفحہ 32-30)

حب الوطنی

28 مارچ 1998 کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں ایک سیمینار تھا۔ اس کا اہتمام اردو اکادمی کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس کا موضوع مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور کارناموں کا جائزہ تھا۔ اس موقع پر میں نے بھی ایک تقریر کی۔ میں نے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک حب الوطنی کا مسئلہ تھا۔

میں نے کہا کہ 20 ویں صدی میں لمبی مدت تک مسلم مفکرین کسی نہ کسی طور پر اس نظریہ سے متاثر رہے ہیں، جس کو عام طور پر پان اسلامزم (pan islamism) کہا جاتا ہے۔ اس میں دَورِ جدید کے بہت سے مفکرین کے نام شامل ہیں۔ مثلاً سید جمال الدین افغانی (1897-1838)، محمد اقبال

(1877-1938)، محمد علی جناح (1876-1948)، سید ابوالاعلی مودودی (1903-1979)، وغیرہ۔ یہ لوگ مسلمانوں کو ایک بین اقوامی برادری سمجھتے تھے، اور مسلمانوں کو ایک عالمی قومیت کا رکن بتاتے تھے۔ اپنے اس نظریہ کی بنیاد پر ان کا کہنا تھا کہ قومیت (nationhood) کی بنیاد مذہب پر ہے، نہ کہ وطن پر۔

میں نے کہا کہ میری عمر ہجری کیلنڈر کے لحاظ سے 78 سال ہو رہی ہے۔ میں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ اسلام اور اسلام سے متعلق علوم کے مطالعہ میں گزارا ہے۔ میں پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ قومیت کو مذہب پر مبنی قرار دینا کوئی اسلامی نظریہ نہیں۔ یہ سراسر ایک سیاسی نظریہ ہے جو مخصوص حالات میں پیدا ہوا۔ 20 ویں صدی کے نصف اول میں مسلمانوں کے سیاسی قائدین یورپی استعمار کے خلاف تمام دنیا کے مسلمانوں کو ابھارنا چاہتے تھے۔ اپنے اس سیاسی مقصد کے نظریاتی جواز کے لیے انھوں نے عالمی قومیت کا مذکورہ نظریہ پیش کیا۔ یہ اسلام کا سیاسی استحصال تھا، نہ کہ اسلام کی حقیقی ترجمانی۔

اس معاملہ میں اسلام کا نقطہ نظر وہی ہے، جو پولیٹکل سائنس کا نقطۂ نظر ہے، اور جس کو تمام دنیا میں نظری یا عملی طور پر قبول کرلیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ قومیت (nationhood) کی بنیاد وطن (motherland) پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام دنیا میں پاسپورٹ پر کسی آدمی کی قومیت (nationlity) وہی لکھی جاتی ہے، جو وطن کی نسبت سے اس کی ہے، خواہ وہ ایک مذہب سے تعلق رکھنے والا ہو، یا دوسرے مذہب سے۔ مثلاً انڈیا میں ہر مسلمان یا غیر مسلمان پاسپورٹ میں اپنے آپ کو انڈین لکھتا ہے، برطانیہ میں برٹش، امریکا میں امریکن، وغیرہ۔

مبنی بر وطن قومیت کا یہ نظریہ اسلام کے عین مطابق ہے۔ اس معاملہ میں اسلام اور بقیہ دنیا میں کوئی اختلاف یا ٹکراؤ نہیں۔ مولانا سید حسین احمد مدنی نے کہا تھا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ اس پر کچھ لوگوں نے یہ اضافہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ مولانا مدنی کا یہ جملہ خبر ہے، وہ انشاء نہیں۔ یعنی یہ ایک واقعہ ہے کہ بقیہ دنیا میں وطن کو قومیت کی بنیاد مان لیا گیا ہے۔ مگر اس کا یہ

مطلب نہیں کہ اسلام میں بھی قومیت کی بنیاد وطن پر قائم ہے۔ مگر یہ تشریح درست نہیں۔ اس سلسلہ میں یہاں میں چند باتیں عرض کروں گا۔ فقہ کا ایک مستقل اصول یہ ہے کہ چیزوں کی اصل (بنیادی حکم) ان کا مباح ہونا ہے (الأَصْل فِي الْأَشْيَاءِ الْإِبَاحَة)، جب تک کہ حرام ہونے کی دلیل نہ ملے:

Everything is lawful unless it is declared unlawful.

یہاں چیز سے مراد دنیوی معاملات ہیں۔ یہ ایک واضح بات ہے کہ قومیت کے مسئلہ کے بارے میں قرآن وحدیث میں کوئی براہِ راست حکم موجود نہیں۔ قرآن وحدیث میں نہ یہ کہا گیا ہے کہ قومیت کی بنیاد مذہب پر ہے، اور نہ یہ کہ اس کی بنیاد وطن پر ہے۔ اس لیے اس معاملہ کو ان امور سے متعلق سمجھا جائے گا، جن کی بابت پیغمبر اسلام نے کہا: أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأَمْرِ دُنْيَاكُمْ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2363)۔ یعنی، تم اپنی دنیا کے معاملہ کو زیادہ جانتے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک عقیدہ اور عبادت اور آخرت کے معاملات کا تعلق ہے، ان میں مسلمان پابند ہیں کہ وہ شریعت کی رہنمائی کو تاویل کے بغیر قبول کریں، مگر جو امور انتظام دنیا سے تعلق رکھنے والے ہیں، ان میں انسان کو اختیار ہے کہ وہ اپنے حالات کے لحاظ سے جس طریقہ کو درست سمجھے اس کو اختیار کرے۔

اس معاملہ میں ایک پیغمبرانہ واقعہ سے مزید رہنمائی ملتی ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یمن میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا اس کا نام مسیلمہ تھا۔ اس نے دو آدمیوں پر مشتمل اپنا ایک سفارتی وفد مدینہ بھیجا۔ انھوں نے مدینہ آ کر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی، اور مدعی نبوت کا یہ تحریری پیغام پہنچایا کہ میں نبوت میں آپ کے ساتھ شریک کیا گیا ہوں (فَإِنِّي قَدْ أُشْرِكْتُ فِي الْأَمْرِ مَعَكَ)۔

مسیلمہ کے دونوں سفیروں سے کلام کرنے کے بعد آپ نے ان سے پوچھا کہ اس بارے میں تمہاری رائے کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہماری بھی وہی رائے ہے جو ہمارے صاحب کی رائے ہے۔ یہ سن کر آپ فرمایا کہ خدا کی قسم اگر ایسا نہ ہوتا کہ سفیروں کو قتل نہیں کیا جاتا تو میں تم دونوں کو قتل کر دیتا: أَمَا وَاللّٰهِ لَوْلَا أَنَّ الرُّسُلَ لَا تُقْتَلُ لَضَرَبْتُ أَعْنَاقَكُمَا (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 600)۔

پیغمبر اسلام کے اس واقعہ سے اسلام کا ایک اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ بین اقوامی معاملات میں شریعت کا طریقہ بھی وہی ہوگا، جو دوسری قوموں کا طریقہ ہے۔ دوسری قوموں میں اگر سفیر کی جان کو ہر حال میں محترم سمجھا جاتا ہے، تو اسلام میں بھی اس کو ہر حال میں محترم سمجھا جائے گا۔ اسی طرح اس پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہنا بھی بالکل درست ہے کہ وطنیت کے معاملہ میں دنیا میں جس اصول کو عمومی طور پر مان لیا جائے وہی شریعت میں بھی اختیار کرلیا جائے گا۔ اس معاملہ کو غیر ضروری طور پر عقیدہ اور مذہب کا مسئلہ نہیں بنایا جائے گا۔

ایک بار میں ایک جلسہ میں شریک تھا۔ وہاں ایک صاحب نے اپنی تقریر میں وطن کی محبت کی اہمیت بیان کی، اور کہا کہ اسلام میں بھی اس کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے: حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الإِيمَانِ (الموضوعات للصغانی، حدیث نمبر 81)۔ یعنی، وطن سے محبت کرنا ایمان کا ایک حصہ ہے۔ ایک عالم دین جو اس وقت جلسہ میں موجود تھے، انھوں نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ حب الوطن من الایمان کوئی حدیث نہیں ہے، یہ تو صرف ایک عربی مقولہ ہے۔

میں نے کہا کہ یہ درست ہے کہ حب الوطن من الایمان حدیث نہیں۔ مگر وہ سادہ طور پر صرف عربی کا ایک مقولہ نہیں، بلکہ وہ فطرت کا ایک مقولہ ہے، جو انسانی نفسیات کی ترجمانی کرتا ہے۔ محدثین عام طور پر اِس قول کو حدیث رسول نہیں مانتے، وہ اِس کو ضعیف یا موضوع قرار دیتے ہیں۔ تاہم کچھ علما نے اس قول کو معنوی اعتبار سے درست قرار دیا ہے۔ مثلاً آٹھویں صدی ہجری کے مشہور عالم محمد بن عبد الرحمن السخاوی (وفات 1497ء) نے اِس قول کے بارے میں لکھا ہے: لَمْ أَقِفْ عَلَيْهِ، وَمَعْنَاهُ صَحِيحٌ (المقاصد الحسنۃ، حدیث نمبر 386)۔ یعنی، میں اِس حدیث سے واقف نہیں، لیکن اس کا مفہوم درست ہے۔ محدثین کے اصول کے مطابق، امام السخاوی کے اِس قول کا مطلب یہ ہے کہ یہ قول حدیثِ رسول کے طور پر ان کو نہیں ملا، لیکن دینِ اسلام میں اس کی اصل پائی جاتی ہے۔ کتابوں کے ذخیرے میں بہت سی چیزیں ہیں، جو خواہ حدیث رسول نہ ہوں، لیکن وہ یقینی طور پر حدیثِ فطرت ہیں۔ اس بات کو بتانے کے لیے محدثین نے وہ اصول بنایا ہے، جس کو السخاوی کے حوالے سے اوپر بیان کیا گیا۔

راقم الحروف کا خیال یہ ہے کہ یہ قول اگر کلامِ رسول کے طور پر ثابت شدہ نہ ہو، تب بھی وہ حدیثِ فطرت ہے۔ جو آدمی وطن کی محبت کو فطرت کا جزء نہ سمجھتا ہو، وہ جانتا ہی نہیں کہ فطرت کیا چیز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وطن سے محبت انسانی فطرت کا ایک لازمی تقاضا ہے، اور فطرت کا تقاضا ہونا ہی اس بات کے لیے کافی ہے کہ حب الوطنی (patriotism) کو اسلام کا ایک حصہ سمجھا جائے۔ اسلام جب دین فطرت (religion of nature) ہے تو فطرتِ بشری کی ہر چیز اسلام کا حصہ قرار پائے گی۔

میں نے کہا کہ اسلام دین فطرت ہے اس لیے فطرتِ انسانی کا ہر صحیح تقاضا بھی عین اسلام کا تقاضا ہے۔ مثال کے طور پر حدیث میں کہیں یہ نہیں آیا ہے کہ حبُ الأمّ من الإیمان (ماں کی محبت ایمان کا حصہ ہے)۔ اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ ہر مسلمان اس کو اپنا فرض سمجھتا ہے کہ اس کے دل میں اپنی ماں سے محبت ہو۔ جس آدمی کے دل میں اپنی ماں کی محبت نہ ہو، وہ اپنے ایمان میں بھی کامل نہ ہوگا۔ کیونکہ فطرت اور ایمان میں کوئی تضاد نہیں۔

اِسی طرح وطن سے محبت بھی بلاشبہ ہر مسلمان کے لیے ایک ایمانی تقاضے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آدمی جس ملک میں پیدا ہوا، جہاں اُس کی پرورش ہوئی، جہاں کی ہوا میں اس نے سانس لیا، جہاں کے لوگوں سے اس کے تعلقات قائم ہوئے، جہاں اُس نے اپنی زندگی کی تعمیر کی، ایسے ملک سے محبت کرنا انسانی شرافت کا تقاضا ہے، اور اِسی طرح وہ انسان کے ایمان واسلام کا بھی تقاضا۔

میں نے کہا کہ جو چیز فطرت انسانی کا جزء ہو، اس کو قرآن وحدیث میں لکھنے کی ضرورت نہیں، وہ قرآن وحدیث میں لکھے بغیر ہی شریعت کا ایک لازمی جزء ہے۔ قرآن وحدیث میں یہ حکم نہیں دیا گیا کہ اے مسلمانو، تم اپنی ماں سے محبت کرو۔ کیونکہ یہ چیز حکم کے بغیر اپنے آپ ہی فطرت کے زور پر حاصل تھی۔ اسی طرح قرآن وحدیث میں یہ لکھنے کی ضرورت بھی نہیں کہ اے مسلمانو، تم اپنے وطن سے محبت کرو۔ کیونکہ وطن سے محبت انسانی شرافت کا تقاضا ہے، وہ انسان ایک پست انسان ہے جس کے دل میں اپنے وطن کے لیے محبت نہ ہو۔ ایسے گہرے فطری تقاضے کے لیے شریعت میں کسی لفظی حکم کی ضرورت نہیں، وہ اپنے آپ ہر مومن کے دل میں پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے۔

یہاں ایک معاملہ کی وضاحت ضروری ہے۔ بعض انتہاپسند ہندو لیڈروں نے لکھا ہے کہ ہندستان کے عیسائی اور مسلمان سچے محب وطن نہیں ہوسکتے۔ اس لیے کہ محب وطن ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس وطن یا اس جغرافی خطہ کو آدمی مقدس سمجھتا ہو، جہاں وہ پیدا ہوا ہے۔ ہندو چونکہ اپنے وطن (ماتر بھومی) کو مقدس سمجھتا ہے، اور اس کو معبود کا درجہ دیتا ہے۔ اس لیے وہی بھارت کا سچا محبِ وطن (دیش بھگت) ہے۔ عیسائی اور مسلمان چونکہ اپنے مخصوص عقیدہ کی بنا پر زمین یا کسی زمینی خطہ کو معبود کی طرح مقدس نہیں سمجھ سکتے، اسی لیے وہ بھارت کے سچے دیش بھگت بھی نہیں ہوسکتے۔

یہ ایک بے بنیاد بات ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے خود ساختہ عقیدہ کی بنا پر اپنی ماں کو معبود مان لے، اور اس کی پرستش کرنے لگے، تو اس بنا پر اس کو یہ کہنے کا لائسنس نہیں مل جائے گا کہ اس کے سوا بقیہ لوگ اپنی ماں سے محبت نہیں کرتے، کیوں کہ وہ اپنی ماں کو معبود نہیں سمجھتے۔ کسی شخص یا گروہ کو بلاشبہ یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنی ماں کو یا اپنے وطن کو معبود سمجھنے لگے۔ مگر کسی کو بھی قانون یا اصول کی بنا پر ایسے لوگوں کو یہ حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ دوسروں کے بارے میں یہ حکم لگائیں کہ وہ اپنی ماں کو یا اپنے وطن کو معبود مانیں، ورنہ وہ نہ اپنی ماں سے محبت کرنے والے قرار پائیں گے، اور نہ اپنے وطن سے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے معاملات کا تعلق عالمی سطح پر مانے ہوئے رواج سے ہے، نہ کہ کسی شخص یا گروہ کے اپنے مفروضہ سے۔ عالمی اور بین اقوامی سطح پر جب یہ مان لیا گیا ہے کہ قومیت کی بنیاد وطن پر ہے، اور وطن سے مراد معروف معنوں میں جغرافی وحدت (geographical unity) ہے، نہ کہ پُراسرار معنوں میں تقدیسی وحدت (religious unity)۔ اس لیے حب الوطنی (patriotism) کا معیار ہر ایک کے لیے یہی ہوگا۔ البتہ ہر ایک کو یہ آزادی حاصل رہے گی کہ وہ اس کے علاوہ کوئی اور عقیدہ پسند کرتا ہو تو اس کو اپنے لیے اختیار کرلے۔ (الرسالہ، ستمبر 1998)

مسلمانوں کی قومیت

آزادی سے پہلے برّ صغیر ہند میں قومیت کے مسئلہ پر دو نقطۂ نظر تھے۔ ایک اقبال کا۔ اُن کا

کہنا تھا کہ قومیت کا تعلق مذہب سے ہے۔ دوسرا نظریہ مولانا حسین احمد مدنی کا تھا۔ اُنھوں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ یعنی عقیدہ کا تعلق مذہب سے ہے اور قومیت کا تعلق وطن سے۔ میرے نزدیک مولانا حسین احمد مدنی کا نظریہ درست تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مذہب کے اعتبار سے ساری دنیا کے مسلمانوں کا ایک مذہب ہے۔ مگر جہاں تک قومیت کا سوال ہے، اس کا تعلق وطن (homeland) سے ہے، یعنی جس مسلم گروہ کا جو وطن ہے وہی اُس کی قومیت ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندستان جیسے ملک پر اگر کوئی مسلم ملک حملہ کرے تو یہ حملہ مسلمانوں کے مذہب پر حملہ نہیں ہوگا بلکہ اُن کے مشترک وطن پر حملہ قرار پائے گا۔ وطن کے خلاف جارحیت کے معاملہ میں مسلمان بھی اُسی طرح دفاع کریں گے جس طرح اُن کے غیر مسلم برادران وطن کریں گے، خواہ یہ حملہ بظاہر کسی مسلم ملک نے کیا ہو یا غیر مسلم ملک نے۔ (الرسالہ اگست، 2000، جودھپور کا سفر)

ایک غیر حقیقی سوچ

علامہ اقبال کی ایک نظم ہے، جس کا عنوان ہے، وطنیت۔ اس میں وہ کہتے ہیں کہ:

تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور

اِس کے بعد ان کا اگلا شعر یہ ہے:

اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیرہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے

یہ نظم کلیاتِ اقبال کے بانگِ درا میں شامل ہے۔ اقبال کے اِس شعر کا اسلام کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں۔ موجودہ دنیا میں قومیت (nationhood) کو مبنی بر وطن (homeland based) چیز سمجھا جاتا ہے۔ میرے نزدیک اِس تصور میں اور اسلام میں کوئی ٹکراؤ نہیں، مگر اقبال

کے ذہن میں اسلام کا وہ تاریخی تصور تھا، جو بعد کو مسلم ایمپائر کے زمانے میں بنا۔ مسلم ایمپائر کے دَور میں سارے مسلمانوں کا وطن ایک ہی مانا جاتا تھا، لیکن دوسری عالمی جنگ کے بعد جب مسلم ایمپائر ٹوٹ گیا اور پچاس سے زیادہ الگ الگ ملک بن گئے تو اب مسلمانوں کی قومیت اُن کے موجودہ وطن کی نسبت سے متعین کی جائے گی۔ اِس معاملے میں مسلم ایمپائر کا زمانہ کوئی معیاری چیز نہیں، قدیم مسلم ایمپائر مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کا ایک وقتی ظاہرہ تھا، وہ اسلام کا دوامی حصہ نہیں۔ (ڈائری، 12 دسمبر 2007)

قومیت کی بنیاد وطن

ڈاکٹر مبارک علی پاکستان کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی ہیں۔ انھوں نے ایک انٹرویو کے دوران کہا کہ آج کل مسلم امہ کا لفظ جس عالمی معنی میں بولا جاتا ہے وہ اس سے پہلے کبھی اسلامی دَور میں موجود نہ تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مسلم امہ ایک مفروضہ ہے جس کا حقیقی تصور نہ پہلے تھا، نہ اب ہے۔ مسلمانوں کی جو بڑی بڑی سلطنتیں بنی ہیں وہ بھی ذو معنی رہی ہیں مثلاً عثمانی ایمپائر کے دوران ارمنین ایک الگ ملت تھی اور اسے ملت ہی بولا جاتا تھا اور ملت کا لفظ بالعموم چھوٹی اقوام کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مسلمانوں میں قومی ریاستوں کا وجود بہت شروع سے رہا ہے۔ تمام مسلمہ اقوام کی شناخت الگ الگ علاقائی لسانی بنیادوں پر یا نسلی بنیادوں پر قائم رہی ہے۔ کیوں کہ اسلام مذہب ہے قوم نہیں۔ میثاق مدینہ میں بھی یہ چیز صاف طور پر دیکھی جاسکتی ہے، جب یہود بھی مسلم امہ میں شامل تھے۔ یہ تصور وقت اور حالات کی مطابقت میں ڈھلتا رہا ہے۔ لٰہذا میری نظر میں ہمارے بین الاقوامی معاملات اور تعلقات انسانی بنیادوں پر ہونے چاہئیں۔ (سنڈے میگزین 18 مئی 2003)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ آئے اور پہلی اسلامی اسٹیٹ بنائی تو اس وقت وہاں کچھ یہودی قبیلے بھی آباد تھے، اس وقت آپ نے ایک ڈکلیریشن جاری کیا جس کو عام طور پر میثاق مدینہ کہا جاتا ہے۔ اس میثاق میں آپ نے لکھا تھا، جس کا ایک جملہ یہ تھا کہ یہود

مسلمانوں کے ساتھ ایک امت ہیں: وإِنَّ یھودَ بَنِي عَوْف أُمَّةٌ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 503)۔ یعنی، اور یہ کہ بنوعوف کے یہود مسلمانوں کے ساتھ ایک امت ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قومیت کی بنیاد ہمیشہ وطن ہوتا ہے، نہ کہ مذہب۔ (ڈائری، 26 اپریل 2004)

اس جملہ میں امت کا لفظ تقریباً اسی معنی میں ہے جس معنی میں آج کل قوم (nation) کا لفظ بولا جاتا ہے۔ یعنی مدینہ کے یہودی اور مدینہ کے مسلمان جو ایک ساتھ ایک وطن میں رہتے ہیں دونوں ہم قوم ہیں، دونوں ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس اصول کو ہندوستان پر منطبق کیا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہاں کے ہندو اور مسلمان دونوں ایک امت یا ایک قوم ہیں۔ دونوں کی قومیت (nationhood) ایک ہے۔ یہی معاملہ دوسرے ان ملکوں کا ہے جہاں مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ رہتے ہیں۔ (ڈائری، یکم اکتوبر 2003)

قوم اور قومیت

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر پیغمبر نے اپنے غیر مومن مخاطبین کو اے میری قوم (يَاقَوْمِ) کے لفظ سے خطاب کیا ہے (مثال کے طور پر قرآن کی ان آیات کا مطالعہ کیجیے، 85 ,79 ,67 ,7:61)۔ اس قرآنی بیان کے مطابق، مومن اور غیر مومن کی قومیت (نیشنلٹی) ایک ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قومیت کا تعلق مذہب سے نہیں ہے، بلکہ وطن سے ہے۔ مذہبی اشتراک کو بتانے کے لیے ملّت کا لفظ بولا جائے گا (النساء، 4:125)، اور وطنی اشتراک کو بتانے کے لیے قومیت کا لفظ (ہود، 11:89)۔ موجودہ زمانہ میں وطن (home land) کو قومیت کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ اسلام کا اصول بھی یہی ہے۔ اسلام کے مطابق بھی وطن ہی قومیت کی بنیاد ہے۔

اس اعتبار سے دوقومی نظریہ ایک غیر اسلامی نظریہ ہے۔ دوقومی نظریہ مسلمانوں میں یہ ذہن پیدا کرتا ہے کہ ہم الگ قوم ہیں اور دوسرے لوگ الگ قوم۔ جب کہ صحیح اسلامی ذہن یہ ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو دوسروں کا ہم قوم سمجھیں، وہ دوسروں کو اے میری قوم کے لوگو، کہہ کر خطاب کرسکیں، جیسا

کہ تمام پیغمبروں نے کیا۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اے لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ اور تم کو شعوب اور قبائل میں تقسیم کردیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو (49:13)۔ اس آیت میں شعب سے مراد وطنی اشتراک سے بننے والی قوم ہے اور قبیلہ سے مراد نسلی اشتراک سے بننے والا گروہ۔ قرآن کے مطابق، یہ دونوں قسم کی گروہ بندی صرف تعارف کے لیے ہے، وہ عقیدہ یا مذہب کے رشتہ کو بتانے کے لیے نہیں۔

1947 سے پہلے کے دَور میں مولانا حسین احمد مدنی نے کہا تھا کہ "فی زمانہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ مولانا موصوف کا یہ بیان بجائے خود درست تھا۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ اُس میں فی زمانہ (موجودہ زمانہ) کی شرط درست نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ قوم ہمیشہ وطن ہی کی بنیاد پر تشکیل پاتی رہی ہے۔ موجودہ زمانہ میں صرف یہ ہوا ہے کہ دوسری بہت سی چیزوں کی طرح، اس معاملہ میں بھی تعین اور تشخص کے لیے جدید طریقے استعمال کیے گئے۔ مثلاً پاسپورٹ میں قومیت کا اندارج، جب کہ پہلے پاسپورٹ کا طریقہ رائج نہ تھا، بین اقوامی حقوق کے تعیّن کے لیے قومیت کی قانونی تعریف، ملک کی نسبت سے کسی قوم کے افراد کے حقوق کو قانون کی زبان میں متعین کرنا، وغیرہ۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ قوم کا لفظ موجودہ زمانہ میں بھی اصلاً اسی معنٰی میں بولا جاتا ہے جس معنٰی میں وہ قدیم زمانہ میں بولا جاتا تھا، صرف اس فرق کے ساتھ کہ پہلے وہ مجمل مفہوم میں بولا جاتا تھا اور اب وہ مفصل مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔

کچھ لوگ قومیت کی تشریح انتہا پسندانہ انداز میں کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ قومیت کو مذہب کے ہم معنٰی بنا دیتے ہیں، مگر یہ ایک نظریاتی انتہا پسندی ہے۔ اس قسم کی نظریاتی انتہا پسندی کی مثالیں خود اہل مذہب میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً موجودہ زمانہ میں کچھ مسلم مفکرین نے اسلام کی تشریح ایسے انتہا پسندانہ انداز میں کی کہ اسلام کے سوا ہر نظام طاغوتی نظام بن گیا۔ کسی مسلمان کے لیے اس طاغوتی نظام میں موافقت کرکے رہنا حرام قرار پا گیا۔ حتی کہ اس مفروضہ طاغوتی نظام میں تعلیم حاصل کرنا، سرکاری ملازمت کرنا، ووٹ دینا، نزاعات کے قانونی تصفیہ کے لیے ملکی عدالت سے رجوع کرنا، سب کا سب حرام قرار پا گیا۔

طاغوتی نظام کا یہ نظریہ بعض افراد کے انتہا پسندانہ ذہن کی پیداوار تھا، اُس کا خدا اور رسول والے اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حقائق نے اس نظریہ کے وابستگان کو مجبور کیا کہ وہ اپنی عملی زندگی میں اس سے دست بردار ہو جائیں۔ چنانچہ اب یہ تمام لوگ بلا اعلان عملی طور پر اس انتہا پسندانہ نظریہ کو چھوڑ چکے ہیں۔ یہی معاملہ قومیت کا بھی ہے۔ مغرب کے کچھ انتہا پسند مفکرین نے قومیت کو توسیع دے کر مکمل مذہب کے روپ میں پیش کیا۔ مگر حقائق کی چٹان سے ٹکرا کر یہ نظریہ ٹوٹ کر ختم ہو گیا۔ اب عملی طور پر قومیت کا تصور تقریباً اسی فطری معنی میں بولا جاتا ہے جس فطری معنیٰ میں وہ قرآن کے اندر استعمال ہوا تھا۔

بیسویں صدی کے نصف اوّل میں اُٹھنے والے مسلم رہنما اس فرق کو سمجھ نہ سکے۔ اُنہوں نے قومیت اور وطنیت کے معاملہ میں اس غیر فطری انتہا پسندی کو اصل سمجھ لیا اور اس بنا پر اُس کے غیر اسلامی ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس کی ایک مثال مشہور مسلم شاعر اقبال (وفات 1938) کی ہے۔ انھوں نے قومیت اور وطنیت کے اس انتہا پسندانہ وقتی تصور کو اصل سمجھ کر اُس کے بارے میں یہ اشعار کہے تھے:

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور   تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے   جو پیرہن اُس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

قومیت اور وطنیت کے بارے میں یہ نظریہ بلاشبہ بے بنیاد ہے۔ عجیب بات ہے کہ اُس دَور کے اکثر مسلم علما اور دانشوروں نے سیاسی نوعیت کی چیزوں کو مذہب یا اسلام کے لیے موت وحیات کا مسئلہ سمجھ لیا۔ حالاں کہ کوئی بھی سیاسی اُتار چڑھاؤ مذہب اسلام کی ابدیت کے لیے چیلنج نہیں بن سکتا۔ مثلاً بیسویں صدی کے آغاز میں ترکی کی عثمانی سلطنت ٹوٹی تو شبلی نعمانی نے یہ شعر کہا:

زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع وملت ہے   عزیزو فکرِ فرزند وعیال وخانماں کب تک

یہ تصور یقینی طور پر بے بنیاد ہے کہ کسی حکومت کا ٹوٹنا ''شرع وملّت'' کے لیے زوال کے ہم معنیٰ ہے۔ ایسا نہ کبھی ہوا اور نہ ایسا کبھی ہو سکتا۔ دَورِ اول میں خلافتِ راشدہ ختم ہوئی مگر اسلام باقی رہا۔ اس

کے بعد اموی سلطنت ٹوٹی تب بھی اسلام کا سفر بدستور جاری رہا، اس کے بعد عباسی سلطنت ٹوٹی، اندلس کی مسلم سلطنت ٹوٹی، مصر کی فاطمی سلطنت ٹوٹی، ہندستان کی مغل سلطنت ٹوٹی، وغیرہ وغیرہ۔ مگر سلطنتوں کا یہ زوال اسلام کے زوال کا سبب نہ بن سکا۔

اسی طرح بیسویں صدی میں کئی انتہا پسندانہ نظریات اُبھرے۔ مثلاً کمیونزم، نازی ازم، نیشنلزم اور وطنیت، وغیرہ۔ مگر ان سب کا آخری انجام یہ ہوا کہ فطرت کا قانون اُن کے انتہا پسندانہ عناصر کو رد کرتا ہے اور آخر کار جو چیز بچی وہ وہی تھی جو قانونِ فطرت کے مطابق مطلوب تھی۔ فطرت کا ابدی قانون ہر دوسری چیز پر بالا ہے۔ فطرت کا قانون اپنے آپ یہ کرتا ہے کہ وہ غیر معتدل افکار کو رد کر کے اُنھیں میدانِ حیات سے ہٹا دیتا ہے اور اُن کے بجائے معتدل افکار کو کام کرنے کا موقع دیتا ہے۔ (الرسالہ فروری، 2004)

قومیت کا مسئلہ

سید جمال الدین افغانی 1838 میں پیدا ہوئے اور 1897 میں اُن کی وفات ہوئی۔ وہ اُس نظریہ کی ایک علامت ہیں جو ترکی کے سلطان عبدالحمید کی حمایت سے شروع ہوئی اور جس کو اتحادِ اسلامی (پان اسلامزم) کہا جاتا ہے۔ سید جمال الدین افغانی کے زمانہ میں تقریباً پوری مسلم دنیا انگریزوں اور فرانسیسیوں کی سیاسی ماتحتی میں آ گئی تھی۔ جمال الدین افغانی اس مغربی اقتدار کو ختم کرنے کے لیے اُٹھے۔ اس مقصد کو طاقت دینے کے لیے اُنھوں نے اتحادِ اسلامی کا نظریہ بنایا۔ اُن کا کہنا تھا کہ تمام دنیا کے مسلمان، خواہ وہ اکثریتی ملک میں ہوں یا اقلیتی ملک میں، وہ سب کے سب ایک واحد اُمّت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ سب کے سب ایک ہی سیاسی وحدت میں بندھے ہوئے ہیں۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اسی نظریہ کے مطابق کہا کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک انٹرنیشنل پارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آیت اللہ خمینی اور دوسرے رہنماؤں نے اس کو الأمۃ (Ummah) کا لفظ دیا جو بہت جلد تمام دنیا کے مسلمانوں میں مقبول ہو گیا۔ اسی نظریہ کو اقبال نے اپنے ایک شعر میں اس

طرح بیان کیا ہے:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے   نیل کے ساحل سے لے کرتا بخاکِ کاشغر

یہ بین اقوامی نظریہ نوآبادیاتی دَور میں حالات سے متصادم نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اُس وقت دنیا کے بیشتر ملک عملاً ایک ہی سیاسی نظام کے تحت تھے۔ تقریباً تمام مسلمان اس ایک سیاسی نظام کے شہری شمار ہوتے تھے۔ مگر جب نوآبادیاتی نظام ٹوٹا اور نیشنلزم کا دَور آیا تو بہت سی الگ الگ سیاسی وحدتیں بن گئیں۔ پہلے اگر ایک ایمپائر کی وفاداری کا مسئلہ تھا تو اب ایک سو قومی وحدتوں کی الگ الگ وفاداری کا مسئلہ سامنے آ گیا:

Pan-Islamism was the dominant ideology of the Muslim world of the 19th century before the rise of Nationalism. (*Encyclopædia Britannica*, Vol. 7, p. 719)

دوسری عالمی جنگ کے بعد دنیا کا نقشہ بدلا تو مسلمان فکری اعتبار سے ایک پیچیدہ صورت حال میں مبتلا ہو گئے۔ جو لوگ عالمی قومیت کے ڈھانچہ میں اپنی سیاسی شناخت بنائے ہوئے تھے، اب اُن کو مقامی قومیت کے ڈھانچے میں دوبارہ اپنی سیاسی شناخت کو تلاش کرنا پڑا۔ اس نازک وقت میں، میرے علم کے مطابق، پوری مسلم دنیا میں صرف ایک عالم تھا جس نے اس سوال کا جواب فراہم کرنے کی کوشش کی۔ یہ مولانا سید حسین احمد مدنی (1957-1879) تھے۔ اُنھوں نے 1947 سے پہلے کی ہنگامی سیاست کے زمانہ میں یہ جرأتمندانہ اعلان کیا کہ: فی زمانہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں (شرح ارمغانِ حجاز، یوسف سلیم چشتی، 1982، نئی دہلی، صفحہ 272)۔ یہ بلاشبہ ایک اجتہادی رہنمائی تھی۔ مگر بدقسمتی سے مولانا موصوف کی وفات کے بعد خود دیوبند کے علما نے یہ اعلان کر کے اُس کو کالعدم کر دیا کہ حضرت نے اس سلسلہ میں جو فرمایا وہ صرف ایک خبر (informal observation or report) تھی، وہ انشا (formal legal declaration) نہ تھی۔

یہ معاملہ کوئی سادہ معاملہ نہیں۔ یہ بے حد نازک معاملہ ہے۔ ضرورت ہے کہ اس معاملہ میں انتہائی غیر جانبدارانہ انداز کے ساتھ غور کیا جائے۔ مولانا حسین احمد مدنی کے موقف سے رجوع کی

صورت میں نظری یا اعتقادی پوزیشن یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی قومیت (nationality) اسلام ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ مسلمانوں کی سیاسی وفاداری مشترک طور پر اُن کے مذہب کے ساتھ وابستہ ہے۔ اب جب کہ ہر ملک میں نیشنلٹی کو وطن (home-land) کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے تو یہ نظریہ ہر جگہ مقامی تقاضوں سے متصادم ہو گیا ہے۔

مثلاً امریکا یا برطانیہ یا انڈیا میں جدید تصورِ قومیت کا تقاضا یہ ہے کہ ان ملکوں میں بسنے والے مسلمانوں کی سیاسی وفاداریاں صرف اپنے وطن کے ساتھ وابستہ ہوں، اُن کی کوئی خارج از وطن سیاسی وفاداری (extra-terrestrial loyalty) نہ ہو۔ جب کہ الأمّہ کا نظریہ برعکس طور پر یہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کی وفاداریاں بین اقوامی اسلام کے ساتھ ہونی چاہئیں، نہ کہ ملکی وطنیت کے ساتھ۔ اس تضاد نے ساری دنیا کے ہر اُس ملک میں مسلمانوں کی نیشنل وفاداری کو مشتبہ کر دیا ہے جہاں مسلمان ایک اقلیت کے طور پر رہتے ہیں۔

یہ ایک بے حد سنگین مسئلہ ہے۔ خالص نظریاتی طور پر مسلمانوں کے لیے دو میں سے ایک کا چوائس ہے۔ یا تو وہ اپنے اعلان کردہ موقف کے مطابق، یہ کہیں کہ ہم عالمی اسلامی قومیت کے فرد ہیں، ہم مقامی قومیت کے قائل نہیں۔ وہ اس موقف کو اختیار کریں اور پھر اُس کی ہر قیمت کو دل کی آمادگی کے ساتھ ادا کریں۔ مثلاً اگر کسی ملک میں اُن کی وطنی وفاداری کو مشتبہ سمجھ کر اُنھیں ملکی فوج میں نہ لیا جائے، اُنھیں وزارت خارجہ میں شامل نہ کیا جائے، اُنھیں سفیر کا عہدہ نہ ملے، ملک کی بین اقوامی نمائندگی کے فورم میں اُن کو جگہ نہ دی جائے، اُن کو اپنے ملک میں درجہ دوم کا شہری سمجھا جائے تو اُنھیں چاہیے کہ وہ اُسے اپنے عقیدہ کی فطری قیمت سمجھ کر اُس کو قبول کریں۔

مسلمانوں کے لیے دوسرا چوائس یہ ہے کہ وہ کھُلے طور پر یہ اعلان کریں کہ الأمّہ کا مذکورہ بین اقوامی نظریہ کچھ مسلم رہنماؤں کا ذاتی نظریہ تھا جو اُنھوں نے مخصوص حالات کے ردعمل میں اختیار کیا اور اُس کو غلط طور پر اسلام کا نام دے دیا۔ اب ہم اس نظریہ کو رد کرتے ہیں اور جیسا کہ مولانا حسین احمد مدنی نے اعلان کیا تھا، ہم اس رائے کو اختیار کرتے ہیں کہ عقیدہ اور مذہب کے اعتبار سے بلاشبہ

تمام دنیا کے مسلمان ہم مذہب ہیں مگر جہاں تک قومیت (nationality) کا تعلق ہے، ہر مسلمان کی قومیت وہی ہے جو اُس کا وطن ہے۔ قومیت کا تعلق وطن سے ہے، نہ کہ مذہب سے۔ یہ اعلان اگر مسلمانوں کی طرف سے کھلے طور پر کر دیا جائے تو مذکورہ تضاد ختم ہو جائے گا اور پھر کسی کو یہ موقع نہ ہوگا کہ وہ اُن کی وطنی وفاداری پر شک کرے۔

مسلمان اگر ان دونوں میں سے کوئی موقف اختیار نہ کریں بلکہ وہ یہ کریں کہ موقف کے بارے میں کھُلے اعلان کے بغیر وہ اپنے اپنے ملک کی مادّی تقسیم میں اپنا حصہ لینے لگیں تو یہ ایک دوہرا معیار (double standard) کی روش ہوگی۔ یعنی اپنے نظری یا اعتقادی موقف میں تبدیلی کا اعلان کیے بغیر خاموشی کے ساتھ اپنے عملی موقف کو بدل لینا۔ اس قسم کی روش ایک افادی (opportunistic) روش قرار پائے گی، نہ کہ کوئی اصولی روش۔

اس طرح دوعملی کی روش اختیار کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ اس کے نقصانات بے حد سنگین ہیں۔ ایسا کرنے کی صورت میں یہ ہوگا کہ مسلمانوں کے اندر سے بااُصول کردار کا مزاج ختم ہو جائے گا۔ اُن کا روحانی ارتقا (spiritual development) رک جائے گا۔ اُن کے اندر فکری عمل (intellectual process) جاری نہ ہو سکے گا۔ اُن کی شخصیت ارتقائی منازل طے کرنے سے محروم ہو جائے گی۔ وہ اُس عظیم نعمت کی لذت سے نا آشنا ہو جائیں گے جس کو قرآن میں ازدیادِ ایمان (48:4) کہا گیا ہے۔ اس صورت حال کا آخری نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ جمود ذہنی کا شکار ہو کر رہ جائیں گے۔ وہ اس قابل نہ رہیں گے کہ وہ علم وفکر کے اعتبار سے دنیا میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دے سکیں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ہر پیغمبر کی امت کو خدا کی طرف سے الگ الگ شریعت اور منہاج دیا گیا (5:48)۔ یہ بات بظاہر امت کے حوالے سے کہی گئی ہے، مگر وہ حقیقۃً زمانہ کی نسبت سے مقصود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر زمانہ کے لوگوں کو ان کے زمانی حالات کی نسبت سے انھیں شریعت اور منہاج عطا کیا گیا۔ اسی لیے فقہ میں مسئلہ بنا ہے کہ زمانہ اور مقام کے بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں: تتغیر الاحکام بتغیر الزمان والمکان (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، اعلام الموقعین

لابن القیم الجوزیۃ، جلد 3، صفحہ 11؛ مجلۃ الاحکام العدلیۃ، مادہ:39)۔

تشریع الٰہی کا یہ اصول صرف پیغمبر اسلام سے پہلے کے لوگوں کے لیے نہیں تھا۔ بلکہ وہ پیغمبر اسلام کے بعد آپ کی امت کے لیے بھی اسی طرح مطلوب ہے۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ پچھلی امتوں کو براہ راست پیغمبر کے ذریعہ اس تبدیلیِ حکم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اوراب ختم نبوت کے بعد علما کے اجتہاد کے ذریعہ تبدیلیِ حکم کا یہ کام انجام پائے گا۔

اس تشریعی اصول کے مطابق، بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ قومیت (nationality) کے معاملہ میں موجودہ زمانہ میں جو تصور عالمی سطح پر رائج اور مسلّم ہوگیا ہے اس کی روشنی میں اجتہاد کر کے دوبارہ اس معاملہ میں شریعت کا موقف متعین کیا جائے گا۔ اور یہ موقف وہی ہے جس کا اعلان 1947 سے پہلے کے زمانہ میں مولانا سید حسین احمد مدنی نے کیا تھا۔

شرعی موقف یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان عقیدہ اور مذہب کے اعتبار سے بلاشبہ ایک عقیدہ اور ایک مذہب رکھتے ہیں مگر جہاں تک قومیت کا تعلق ہے وہ ملک کی نسبت سے متعین ہوگی۔ یعنی ہر ملک کے مسلمانوں کی قومیت وہی قرار پائے گی جو اس ملک کے دوسرے گروہوں کی ہے۔ (الرسالہ دسمبر 2003)

ہندستانی قومیت

اس وقت ہماری گفتگو کا موضوع ہے— ہندستانی قومیت کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے:

What Constitutes Indian Nationalism

یہ سوال بلاشبہ نہایت اہم قومی سوال ہے۔ اس سوال کے حل پر ملک کی تعمیر وترقی کا انحصار ہے۔ اس اعتبار سے اس سوال کو 1947 ہی میں آخری طور پر طے ہوجانا چاہیے تھا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ آج بھی اس سوال پر بحث جاری ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقریباً نصف صدی گزرنے پر بھی اس سوال کا متفق علیہ جواب معلوم نہ کیا جاسکا۔

اس غیر معمولی تاخیر کا سبب کیا ہے۔ میرے نزدیک اس کا بنیادی سبب ہے — ایک چیز اور دوسری چیز کے فرق کوملحوظ نہ رکھنا۔ سماجی زندگی میں ہمیشہ کچھ چیزیں نیشنل (مشترک) ہوتی ہیں، اور کچھ چیزیں پرائیویٹ (غیر مشترک)۔ نیشنل حصہ میں یکسانیت مطلوب ہوتی ہے، اور پرائیویٹ حصہ میں تعدد۔ نیشنل معاملات کو اگر ہر آدمی کے ذوق (taste) پر چھوڑ دیا جائے تو ملک تباہ ہوجائے گا۔ اسی طرح پرائیویٹ حصہ میں اگر تمام لوگوں کو ایک روش پر قائم کرنے کی کوشش کی جائے تو سارا سماج انتشار کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔

اس مسئلہ کے الجھاؤ کے ذمہ دار مختلف فرقوں کے وہ پر جوش لوگ ہیں جو دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہ رکھ سکے۔ انھوں نے یہ غلطی کی کہ ایک نیشنل معاملہ کو پرائیویٹ بنانے کی کوشش کی، اور ایک معاملہ جو پرائیویٹ تھا اس کو نیشنل درجہ دینے پر اصرار کیا۔ اس قسم کی غیر فطری اور غیر حقیقت پسندانہ کوشش صرف انتشار پیدا کرسکتی تھی، اور اس نے صرف وہی پیدا کیا۔

مثال کے طور پر ہمارے جن لیڈروں نے ”کامن سول کوڈ“ کی دفعہ دستورِ ہند میں شامل کی، انھوں نے ایک پرائیویٹ معاملہ کو نیشنل بنانے کی کوشش کی۔ کیوں کہ شادی بیاہ یا نکاح وطلاق کا معاملہ لوگوں کی پرائیویٹ زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ ہر ایک کا انفرادی معاملہ ہے، نہ کہ پورے ملک کا قومی معاملہ۔ اسی غلطی کا یہ نتیجہ ہے کہ اس دستوری دفعہ نے غیر ضروری بحث پیدا کرنے کے سوا اب تک کچھ اور نہیں کیا۔

اسی طرح کچھ مسلمان پاکستان کی جیت پر خوشی مناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاکستان ایک مسلم ملک ہے، اس بنا پر یہ ہمارے لیے ایک جذباتی مسئلہ ہے۔ مگر یہ نیشنل معاملہ کو پرائیویٹ معاملہ بنانا ہے۔ انڈیا ہمارا وطن ہے۔ جب بھی انڈیا کا مقابلہ کسی دوسرے ملک سے ہوگا، خواہ وہ کرکٹ کے میدان میں ہو یا جنگ کے میدان میں، تو ہمارے جذبات لازمی طور پر اپنے وطن کے ساتھ ہوں گے۔ اس معاملہ میں انفرادی روش ہرگز قابلِ برداشت نہیں ہوسکتی — نان کامن کو کامن بنانا جتنا غلط ہے، اتنا ہی کامن کو نان کامن بنانا بھی غلط ہے۔

اس مسئلہ کو سادہ اور فطری طور پر سمجھنے کی آسان صورت یہ ہے کہ اس کو خاندان کی سطح پر دیکھا جائے۔خاندان کسی قوم کی ابتدائی یونٹ ہوتا ہے۔ بہت سے خاندان کے مجموعہ ہی کا نام نیشن ہے۔اب دیکھیے کہ خاندان کی سطح پر اس مسئلہ کی نوعیت کیا ہے۔آپ جانتے ہیں کہ خاندان کی سطح پر ہمیشہ کچھ باتیں کامن انٹرسٹ کی ہوتی ہیں۔ان میں ہر فیملی ممبر کی رائے صرف ایک ہوتی ہے۔اور ان کے علاوہ کچھ چیزیں انفرادی ذوق (taste) کی ہوتی ہیں۔ان میں ہر فیملی ممبر کی سوچ الگ الگ ہوتی ہے۔

کامن انٹرسٹ میں مثال کے طور پر ایک اہم چیز معاشی یا مالی انٹرسٹ ہے۔ وہ چیزیں جو فیملی کے معاشی انٹرسٹ سے تعلق رکھتی ہوں ان میں ہر ایک کی سوچ بالکل یکساں ہوتی ہے۔ایسے معاملات میں فیملی کے تمام ممبر بلا اختلاف ایک ہی نقطۂ نظر کو اپنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایسے معاملات میں اگر کئی نقطۂ نظر چلائے جائیں تو خود فیملی کا وجود ہی خطرہ میں پڑ جائے گا۔

مگر جہاں تک انفرادی ٹیسٹ کا معاملہ ہے، تو یہاں ہر ایک کا کیس الگ الگ بن جاتا ہے۔ مثلاً کوئی ایک قسم کا کھانا پسند کرتا ہے اور کوئی دوسرے قسم کا کھانا۔ کوئی ویسٹرن لباس پہنتا ہے اور کوئی ایسٹرن لباس۔ کسی کو ادب سے لگاؤ ہوتا ہے اور کسی کو سائنس سے۔ کوئی کٹر مذہبی ہوتا ہے اور کوئی مذہب کے معاملہ میں لبرل ہوتا ہے۔ کسی کو ایک رنگ کا فرنیچر پسند ہوتا ہے اور کسی کو دوسرے رنگ کا فرنیچر، وغیرہ۔

اسی دوگانہ اصول پر تمام خاندانوں کا نظام چل رہا ہے۔ خواہ وہ ہندو خاندان ہو یا مسلم خاندان، یا اور کسی کمیونٹی سے تعلق رکھنے والا خاندان۔ ہر ایک کے لیے فطرت کا یہی اصول ہے، اور دنیا میں ہر جگہ یہی اصول کارفرما ہے۔

نومبر 1991 میں شولاپور (مہاراشٹر) میں قومی ایکتا کے موضوع پر ایک سیمینار تھا۔ اس میں مجھے شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ اس موقع پر مقامی ایم ایل اے شری تلسی داس جادھو نے بھی تقریر کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں نے اپنے گھر میں دیکھا ہے کہ میرے باپ نان ویجیٹیرین

تھے۔ میری ماں کٹر قسم کی ویجیٹیرین تھی۔ اس کے باوجود دونوں میں کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ میں نے سالہا سال تک دیکھا ہے کہ میری ماں صبح اٹھ کر پہلے میرے باپ کے لیے میٹ بناتیں اور اس کو کھانے کی میز پر رکھ دیتیں۔ اس کے بعد وہ غسل خانہ میں جا کر نہاتیں اور پھر اپنے لیے دال سبزی والا کھانا بناتیں۔

میری ماں اسی طرح آخر عمر تک کرتی رہیں۔ کھانے کے معاملہ میں دونوں کے درمیان اتنا بڑا فرق تھا۔ مگر اس سوال پر دونوں میں کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔ دونوں زندگی بھر عزت اور محبت کے ساتھ مل کر رہتے رہے۔

یہی معاملہ ہر فیملی کا ہے۔ ہر فیملی میں کچھ چیزیں مشترک ہوتی ہیں اور کچھ چیزیں غیر مشترک۔ مشترک حصہ سے مراد وہ چیزیں ہیں جو سب سے یکساں طور پر تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً خاندان کی عزت، خاندان کا کاروبار، خاندان کی ترقی، خاندان کا تحفظ۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو خاندان کے ہر فرد کا مشترک کنسرن ہوتی ہیں۔ ان چیزوں میں فیملی کے ایک فرد اور فیملی کے دوسرے فرد میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

خاندانی زندگی کا دوسرا حصہ وہ ہے جو غیر مشترک ہوتا ہے۔ اس میں ہر آدمی اپنے اپنے ذوق پر چلتا ہے۔ یہ غیر مشترک حصہ ہے — کھانا پینا، لباس، تفریحات، شخصی عادتیں، وغیرہ۔ زندگی کا فطری اصول یہ ہے کہ مشترک امور میں تمام افراد کو ایک نقطۂ نظر کا پابند کیا جائے۔ مگر غیر مشترک امور میں ہر ایک کو آزادی دے دی جائے کہ وہ اپنی ذاتی پسند سے جو روش چاہیں اختیار کریں۔ وحدت کے ساتھ تنوع، اور تنوع کے ساتھ وحدت کے اسی اصول میں کسی سماج کی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے۔

خاندان ہی جیسا معاملہ بڑے پیمانہ پر قوم کا بھی ہے۔ یہاں بھی ایک قومی انٹرسٹ ہے، اور دوسرا انفرادی انٹرسٹ۔ اگر ان دونوں کی علاحدہ علاحدہ رعایت کی جائے اور ان میں کنفیوز نہ کیا جائے تو نیشن کا معاملہ درست طور پر چلتا رہے گا۔ اور اگر دونوں کے فرق کو نظر انداز کر دیا جائے اور غیر ضروری طور پر نظریاتی رولر چلا کر دونوں کو ایک کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کے بعد یہ مسئلہ سادہ طور پر ایک سماجی مسئلہ نہیں رہتا، بلکہ وہ ایسے میدانِ جنگ کا مسئلہ بن جاتا ہے جو کبھی حل نہ ہو سکے۔

خاندان رشتہ داری کی بنیاد پر بنتا ہے اور قوم وطن کی بنیاد پر بنتی ہے۔ قومیت کا سادہ اصول یہ ہے کہ ایک زمینی خطہ میں جو لوگ رہتے ہیں وہ سب ایک قوم ہیں۔ مثلاً انڈیا میں جو ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، رہتے ہیں وہ سب کے سب ایک قوم ہیں۔ خواہ اس واحد قوم کو ہندستانی کہا جائے یا اس کو انڈین یا بھارتی کا نام دیا جائے۔

ہندستانی قومیت کے اس انسانی مجموعہ میں ایک چیز کامن ہے، اور اسی کے ساتھ کچھ چیزیں ایسی ہیں جو انفرادی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ چیزیں جن کا تعلق انڈیا کی انٹگریٹی یا اس کے مجموعی مادی انٹرسٹ سے ہو، اس میں اس خطۂ ارض میں بسنے والے ہر آدمی کا نقطۂ نظر ایک ہوگا۔ مثلاً کشمیر کا مسئلہ کسی مسلمان کے لیے مسلم مسئلہ نہیں ہوگا بلکہ وہ اس کے لیے صرف انڈین مسئلہ ہوگا۔ اسی طرح پنجاب کا مسئلہ کسی سکھ کے لیے سکھ مسئلہ نہیں ہوگا بلکہ وہ اس کے لیے انڈین مسئلہ ہوگا۔ اسی طرح آسام کا مسئلہ کسی کرشچین کے لیے کرشچین مسئلہ نہیں ہوگا بلکہ وہ اس کے لیے انڈین مسئلہ ہوگا۔ اسی طرح وہ تمام مسائل جن سے ملک کا مجموعی سیاسی، معاشی، جغرافی انٹرسٹ وابستہ ہو، ان میں کسی بھی فرد یا کمیونٹی کی سوچ علاحدہ نہیں ہوگی۔

مگر اس مشترک نیشنل انٹرسٹ کے باہر بہت سی چیزیں ہیں جن کا تعلق انفرادی ذوق سے ہے۔ ان دوسرے پہلوؤں میں ہر ایک کو اپنے نجی دائرہ میں آزادی حاصل ہوگی۔ مثلاً مذہب، خوراک، لباس، زبان، رہن سہن، شادی بیاہ، جیسے معاملات میں ہر ایک کو اپنے محدود دائرہ میں آزادی ہوگی کہ وہ اپنی انفرادی پسند کے مطابق جو انداز چاہے اس کو اختیار کرے۔ یہی طریقہ آج تمام ترقی یافتہ ملکوں میں رائج ہے۔

اس انفرادی آزادی پر اگر کوئی شرط لگائی جاسکتی ہے تو وہ صرف یہ کہ کسی کو اپنی آزادی اس حد تک نہیں بڑھانا چاہیے کہ وہ دوسرے کی آزادی میں خلل اندازی کا سبب بن جائے۔ اس معاملہ میں وہی اصول صادق آتا ہے جو ایک امریکی شہری نے راستہ پر چلنے والے اپنے ایک ہم وطن سے اس وقت کہا تھا جب کہ اس نے اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کی ناک پر مار دیا

تھا۔اس نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ تم کو آزادی حاصل ہے۔مگر تمہاری آزادی وہاں ختم ہوجاتی ہے جہاں سے میری ناک شروع ہوتی ہے:

Your freedom ends where my nose begins.

حقیقت یہ ہے کہ ہمالیہ پہاڑ اور بحر ہند کے درمیان واقع ایک زمینی خطہ جس کو ہمارے دستور نے ”انڈیا“ کے طور پر ڈیفائن کیا ہے، اس میں بسنے والا ہر آدمی انڈین ہے۔ یہ سب کے سب لوگ ایک قوم ہیں۔سب کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک ہی قومی سوچ کو اپنی شناخت بنائیں اور باہم مل جل کر زندگی گزاریں۔

مگر اس وسیع قومی مجموعہ کے اندر جو افراد آباد ہیں، اپنے نجی دائرہ میں ان کا طرز زندگی (mode of life) یکساں نہیں ہوسکتا۔اور نہ کسی بھی ملک میں وہ یکساں ہے۔ پہلے دائرہ کے لیے فطرت کا تقاضا ہے کہ سب کا طرز فکر ایک ہو۔مگر عین اسی فطرت کا یہ تقاضا بھی ہے کہ نجی دائرہ میں ان کے درمیان تنوع پایا جائے۔ایک ماں باپ سے پیدا ہونے والے چار بھائی خاندان کے مشترک مفاد کے معاملہ میں تو ایک مشترک طرز فکر کے حامل ہوتے ہیں۔مگر ذاتی دائرہ میں چاروں بھائیوں کا مزاج اور چاروں بھائیوں کی پسند الگ الگ بن جاتی ہے۔

معلوم ہوا وہ چیز جس کو ہم انڈین نیشن کہتے ہیں، اس کے دو دائرے ہیں۔ ایک دائرہ میں یکسانیت مطلوب ہے اور دوسرے دائرہ میں تنوع۔ یکسانیت والے دائرہ میں تفرق برداشت نہیں کیا جا سکتا۔مگر تنوع والے دائرہ کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ یہاں کامیاب زندگی حاصل کرنے کا راز صرف ایک ہے، اور وہ ہے ایک دوسرے کے درمیان فرق کو ٹالریٹ کرنا۔ پہلے معاملہ میں اگر ”من تو شدم تو من شدی“ کا اصول کارفرما ہے تو دوسرے معاملہ میں Let us agree to disagree کا اصول۔

ہندستانی قومیت کی کامیاب تعمیر اسی وقت ممکن ہے جب کہ ان دونوں حصوں کے فرق کو سمجھتے ہوئے ہر ایک کی صحیح رعایت کی جائے۔ پہلے دائرہ میں علاحدگی پسندی اگر اتنی بری چیز ہے جس کو قومی غداری کہا جائے تو دوسرے دائرہ کے معاملہ میں برعکس طور پر Walt Whitman کا یہ قول

صادق آتا ہے کہ میں اتنا زیادہ وسیع ہوں کہ ان تمام تضادات کو اپنے اندر سموسکوں:

I am large enough to contain all these contradictions.

(الرسالہ فروری، 1995)

مادر وطن کہنا

ایک صاحب نے ای میل کے ذریعے یہ سوال کیا کہ انڈیا کو مادرِ وطن کہنا جائز ہے یا ناجائز۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مادرِ وطن کو جائز یا ناجائز کی اصطلاح میں بیان کرنا اس کو غیر ضروری طور پر شرعی مسئلہ بنانا ہے۔ یہ انتہاپسندی (extremism) ہے کہ ہر چیز کو جائز یا ناجائز کا مسئلہ بنایا جائے۔ اس مزاج کو شریعت میں غلو کہا گیا ہے، اور قرآن وسنت میں غلو کی ممانعت کی گئی ہے۔ ایک مرتبہ صحابیِ رسول وابصۃ الاسدی رسول اللہ کے پاس آئے۔ وہ بہت سا سوال کرنا چاہتے تھے۔ رسول اللہ نے ان کے سوالوں کا جواب نہیں دیا۔ بلکہ یہ کہا: استَفْتِ قَلْبَكَ (مسند احمد، حدیث نمبر 18006)۔ یعنی، اپنے دل سے فتویٰ پوچھو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر بات کو شرعی مسئلہ نہ بناؤ۔ بلکہ اپنی فطرت کی آواز کی پیروی کرو۔ جو لوگ انڈیا کو مادرِ وطن کہتے ہیں۔ وہ اس معنی میں نہیں کہتے کہ وہ اسی جغرافیہ کے بطن سے پیدا ہو کر نکلے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ استعارہ (metaphor) کی زبان ہے۔ اصل یہ ہے کہ مادر وطن سے مراد وہی چیز ہے، جس کو دوسرے الفاظ میں مسقط الراس، مقامِ پیدائش (home land)، برتھ پلیس (birth place)، وغیرہ، کہا جاتا ہے۔ اگر بالفرض کچھ لوگ مادر وطن کا لفظ اس معنی میں بولیں کہ وہ وطن کے پیٹ سے اسی طرح پیدا ہوئے ہیں، جس طرح کوئی شخص ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ تو یہ ان کا اپنا معاملہ ہوگا، نہ کہ آپ کا معاملہ۔

آپ مادرِ وطن کا لفظ اپنے مفہوم میں بولیے۔ دوسرے لوگوں کو چھوڑ دیجیے کہ وہ کس معنی میں اس لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ بھی زندگی کی ایک حکمت ہے کہ کسی بات کو اس کی منطقی حد (logical end)

تک نہ پہنچایا جائے۔ بلکہ اس کو معروف مفہوم کے اعتبار سے لیا جائے۔

مادر وطن (بھارت ماتا) کی اصطلاح انیسویں صدی کے آخری زمانے میں شروع کی گئی۔ یہ آزادی کی تحریک چلانے والے لیڈروں نے سیاسی مقصد کے تحت استعمال کیا تھا۔ اس اصطلاح کا کوئی مذہبی پس منظر نہیں۔ (الرسالہ، ستمبر 2016)

کمیونل ہارمنی

16 اپریل 1994 کو بھارتیہ مزدور سنگھ کی دعوت پر میں ناگپور میں تھا۔ یہاں ریشم باغ (ناگپور) میں ان کا ایک اجلاس تھا، جس میں میرا افتتاحی خطاب تھا۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ آزادی کے بعد ہندوستان وہ ترقی یافتہ ہندوستان نہ بن سکا جو اس کو بننا چاہیے تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ملک میں ایکتا نہ ہونا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنا مشن دیش میں کمیونل ہارمنی کو بنایا ہے۔

اس سلسلہ میں جو باتیں کہیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ اس کا سبب دونوں طرف غیر ضروری قسم کی غلط فہمیاں پیدا ہونا ہے۔ دونوں فرقوں میں اگر ملنا جلنا بڑھ جائے تو اپنے آپ غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔ اور لوگوں کے درمیان نارمل تعلقات قائم ہو جائیں گے۔

میں نے مختلف واقعات بیان کیے۔ اور واقعاتی مثالوں کے ذریعہ بتایا کہ ہر آدمی انسان ہے۔ کوئی آدمی اگر آپ کو اپنا مخالف دکھائی دے تو یہ اس کی صرف عارضی حالت ہے۔ پھر میں نے کہا کہ وندے ماترم یا اس طرح کی دوسری چیزوں پر کچھ مسلمان جو اتنا زیادہ بھڑکتے ہیں اس کی وجہ حقیقت نہیں ہے، بلکہ غیر ضروری حساسیت ہے۔ 1947 سے پہلے اس قسم کی حساسیت مسلمانوں میں موجود نہیں تھی۔ اس لیے خود مسلمان اس قسم کی باتیں کہتے تھے مگر کوئی ردعمل نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اقبال کے چند اشعار سنائے۔ مثلاً:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل وطن سمجھتے ہیں اس کو امام ہند

1947ء سے پہلے کوئی مسلمان اقبال کے ان اشعار پر بھڑکتا نہیں تھا۔ آج کوئی ہندو یا مسلمان ایسی کوئی بات کہہ دے تو فوراً اخباروں میں بیانات اور مراسلے چھپنے لگتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نااہل لیڈروں نے غیر ضروری طور پر مسلمانوں کو ان باتوں کے بارے میں حساس بنا دیا ہے۔ (ناگپور کا سفر 1994)

حب الوطنی اور قومی یکجہتی

مسلم علما کی ایک نشست تھی۔ ایک صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ مسلمانوں کے اوپر یہ غلط الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ ملک کی مین اسٹریم (مکھیہ دھارا) میں نہیں ہیں، وہ بلاشبہ ہیں۔ میں نے کہا کہ میرے نزدیک یہ شکایت بالکل بجا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ کیسے۔ میں نے کہا کہ مین اسٹریم میں اپنے آپ کو شامل کرنے کا آغاز یہاں سے ہوتا ہے کہ آپ یہ مانیں کہ ہندو اور مسلمان دونوں ایک قوم ہیں۔ جب کہ یہی بات اب تک حاصل نہیں ہوئی۔

میں نے کہا کہ ہندوستان کا ہر عالم جو پاسپورٹ بنواتا ہے وہ نیشنلٹی کے خانہ میں اپنے آپ کو اسی طرح انڈین لکھتا ہے جس طرح ایک ہندو لکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندو اور مسلمانوں دونوں کی نیشنلٹی ایک ہے اور دونوں ایک قوم ہیں۔ مگر علما نے ابھی تک اس کا اعلان نہیں کیا۔ 1947 سے پہلے مسلم لیگ کی تحریک زیر اثر تمام مسلمانوں کے ذہن میں یہ بھرا گیا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قوم ہیں۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر وہی ذہن اب تک چلا جا رہا ہے۔ دونوں کو نیشنل مین اسٹریم میں لانے کے لیے پہلا کام یہ ہے کہ علما کی طرف سے ایک متفقہ اعلان شائع ہو کہ قومیت کا

تعلق وطن سے ہوتا ہے۔ چونکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا وطن ایک ہے، اس لیے دونوں ایک قوم ہیں۔ پاسپورٹ کا ذاتی فائدہ اٹھانے کے لیے تمام لوگ اس کے فارم پر اپنی نیشنلٹی انڈین بتا رہے ہیں۔مگر اسی بات کا عمومی اعلان کرنے کے لیے تیار نہیں۔ کیسا عجیب ہے یہ تضاد جو لوگوں کی زندگیوں میں پایا جاتا ہے۔(ڈائری،26 نومبر 1995)

گڈ انڈین

انگریزی میگزین سنڈے کے شمارہ 25-19 نومبر 1995 میں مسٹر ارُن شوری (پیدائش 1941) کا ایک تفصیلی انٹرویو چھپا۔اس کے انٹرویو رمنی شنکر ایّر تھے۔اس انٹرویو میں مسٹر ارُن شوری نے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ ایک اچھے مسلمان (Good Muslim) کا ایک اچھا انڈین (Good Indian) ہونا بہت مشکل ہے۔ میں نے اس انٹرویو کو پڑھنے کے بعد مسٹر ارُن شوری کو ٹیلی فون کیا۔ میں نے کہا: یہ بتائیے کہ میں گڈ مسلم ہوں یا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ کون کہہ سکتا ہے کہ آپ گڈ مسلم نہیں ہیں۔ میں نے کہا کہ پھر سن لیجئے کہ میں ایک گڈ مسلم بھی ہوں اور گڈ انڈین بھی ہوں۔ یہ کہتے ہوئے میری زبان سے نکلا— اگر میں گڈ انڈین نہیں ہوں تو مہاتما گاندھی بھی گڈ انڈین نہیں تھے۔

اس واقعہ کے چند روز بعد ڈاکٹر مہیش چندر شرما (ممبر پارلیمنٹ) میرے دفتر میں ملاقات کے لیے آئے۔ میں نے ان سے مذکورہ گفتگو نقل کی۔ انھوں نے اس کو سن کر کہا: مولانا صاحب، آپ کے گڈ انڈین ہونے کے لیے کسی ارُن شوری کے سرٹیفکٹ کی ضرورت نہیں۔ آپ ایسے کسی سرٹیفکٹ کے بغیر ہی گڈ انڈین ہیں۔(ہند-پاک ڈائری)

اس کے بعد کا واقعہ ہے۔ 23 نومبر تا یکم دسمبر 1996 میں پونے کے سفر میں تھا۔ایک رات کو فجر سے پہلے چار بجے سو کر اٹھا۔وضو کر کے دو رکعت نماز لمبی قرأت کے ساتھ پڑھی۔اس کے بعد اپنے کمرہ میں بیٹھا تو اچانک یاد آیا کہ شری گرو گولوالکر (1973-1940) اور مسٹر ارن شوری نے لکھا ہے کہ ایک گڈ مسلم کبھی گڈ انڈین نہیں بن سکتا۔ یہ سوچتے ہوئے بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو

نکل آئے کہ یہ لوگ انسان کو کتنا کم جانتے ہیں۔ ان سے کہیں زیادہ انسان سے واقف انیسویں صدی کا امریکی شاعر والٹ وھٹ مین (Walt Whitman) تھا جس نے کہا کہ:

I am large enough to contain all these contradictions.

میں یہ کہہ رہا تھا اور رو رہا تھا کہ بخدا میں ایک گڈ مسلم ہوں اور اسی کے ساتھ میں گڈ انڈین بھی ہوں۔ یہ میری شرافت انسانی کی توہین ہے کہ یہ کہا جائے کہ میں جس ملک میں پیدا ہوا، اس کا میں اچھا شہری نہیں ہوں۔ وطن کی محبت ایک خالص فطری جذبہ ہے۔ اور جس چیز کی جڑیں خود فطرت انسانی میں ہوں اس سے کوئی انسان کبھی خالی نہیں ہوسکتا۔

میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر مہاتما گاندھی پیدا ہوں اور کہیں کہ میں تم کو گڈ انڈین ہونے کا سرٹیفکیٹ دیتا ہوں تو میں ایسا سرٹیفکیٹ لینے سے انکار کر دوں گا۔ میں کہوں گا کہ کیا کسی بیٹے کو اس کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی ماں کا اچھا بیٹا بننے کے لیے کسی اور کا سرٹیفکیٹ حاصل کرے۔ بخدا میں کسی گرو گولوالکر یا کسی گاندھی کے سرٹیفکیٹ کے بغیر ہی ایک گڈ انڈین ہوں۔ انڈیا کی محبت میں نکلنے والے میری تنہائیوں کے آنسو جن کو دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا وہ بذات خود اس کے لیے کافی ہیں کہ میں اپنے آپ کو پورے معنی میں ایک گڈ انڈین سمجھوں۔ (پونہ کا سفر، نومبر 1996)

سچی حب الوطنی

اسلام کی تاریخ میں صلح حدیبیہ نام ہے اسٹیٹس کو پر راضی ہونے کا اور نزاعی امور میں یہی واحد قابل عمل طریقہ ہے کہ آدمی اسٹیٹس کو (status quo) پر راضی ہوجائے۔

راحت ابرار صاحب (علی گڑھ) خورشید احمد صاحب (بمبئی) اور دوسرے کئی مسلمانوں سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ میں نے ہندوؤں کی کئی مجلسوں اور میٹنگوں میں کئی بار یہ کہا کہ کہا جاتا ہے کہ مسلمان اچھا انڈین نہیں ہوسکتا۔ یہ ایک بے اصل بات ہے۔ میں پورے معنوں میں ایک مسلمان ہوں۔ اس کے باوجود پورے معنوں میں ایک اچھا انڈین ہوں۔ پھر میں نے کہا کہ اگر میں اچھا انڈین نہیں ہوں تو مہاتما گاندھی بھی اچھے انڈین نہیں تھے۔ میں نے مزید کہا کہ مجھے اچھا

انڈین بننے کے لیے کسی گرو گولوالکر کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں۔ ایسے کسی سرٹیفکیٹ کے بغیر میں ایک اچھا انڈین ہوں۔

ان لوگوں سے میں نے مزید یہ کہا کہ ہندوؤں کے سامنے یہ کہنے کی جرأت مجھے اس لیے ہوتی ہے کہ مجھے انڈیا سے سچی محبت ہے۔ میں پورے معنی میں ایک محب وطن ہوں۔ مثلاً ایک مسلم ملک اور انڈیا کا کسی میدان میں آمنا سامنا ہو تو میں دل سے چاہوں گا کہ مسلم ملک کے مقابلے میں انڈیا کو جیت حاصل ہو۔ (ڈائری، 14 نومبر 1996)

احساسِ وطنیت

ڈاکٹر حمید اللہ ندوی بھوپال یونیورسٹی میں عربی کے شعبہ میں استاد ہیں۔ وہ دہلی آئے۔ ایک گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کی نااہل مسلم قیادت نے ایک خطرناک کام یہ کیا ہے کہ اپنی بے حقیقت باتوں سے انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں سے احساس وطنیت چھین لیا۔ یہاں کے مسلمانوں کا حال اب یہ ہے کہ وہ صحیح معنوں میں ہندوستان کو اپنا وطن نہیں سمجھتے اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ دوسرا کوئی ملک انہیں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس طرح وہ ذہنی طور پر خود اپنے ملک میں بھی بے جگہ ہو گئے ہیں اور دوسرے ملکوں میں بھی۔ اس ذہنیت نے مسلمانوں کو بے پناہ نقصان پہنچایا ہے۔ (ڈائری، یکم اکتوبر 1997)

موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں نے نیشنلزم اور حب الوطنی کے خلاف اتنا زیادہ غوغا برپا کیا کہ اب وہ کثیر تعداد مسلمانوں کی نفسیات کا جزء بن گیا ہے۔ اس کے لیے ایک دلیل یہ دی گئی کہ موجودہ نیشنلزم اور حب الوطنی سے مسلمانوں کا تشخص مٹ جائے گا، وہ ایک مستقل ملت کی حیثیت سے اپنا وجود ختم کر دیں گے۔ مگر یہ خطرہ صرف بے شعوری کی پیداوار تھا۔ زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اس کے نتیجہ میں مسلمان علیحدگی پسندی کا شکار ہو گئے۔ اور پھر ان کے ساتھ عملاً یہ پیش آیا کہ ایک طرف ان کی دنیوی ترقی رک گئی تو دوسری طرف ان کے دین کے تعلق سے عام انسانوں میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ (ناگپور کا سفر 1994)

امیر بھارت، غریب امریکا

ایک بار مدر ٹریسا (1997-1901) امریکا میں مدعو کی گئیں وہ ایک بڑے جلسہ میں شریک ہوئیں جس میں صدر امریکا بھی موجود تھے۔ اس موقع پر مدر ٹریسا سے کچھ بولنے کی فرمائش کی گئی اپنی بات شروع کرتے ہوئے انھوں نے پہلا جملہ یہ کہا: میں امیر بھارت سے غریب امریکا میں آئی ہوں۔

ان کا مطلب یہ تھا کہ امریکا اگرچہ مادی اعتبار سے امیر ہے، مگر روحانی اعتبار سے وہ مفلس ہے، جب کہ بھارت مادی اعتبار سے پیچھے ہونے کے باوجود روحانی اعتبار سے امریکا سے آگے ہے۔

مدر ٹریسا البانیہ میں پیدا ہوئیں۔ نوجوانی کی عمر میں انھوں نے انڈیا کی شہریت اختیار کرلی۔ اس کے بعد انھوں نے سچ مچ انڈیا کو اپنا وطن بنالیا۔ مذکورہ جملہ احساس وطنیت کے تحت نکلا ہوا جملہ ہے بہت سے لوگ جو انڈیا ہی میں پیدا ہوئے۔ اس کے باوجود وہ مذکورہ قسم کے احساس وطنیت سے محروم ہیں۔ (ڈائری، 2 اکتوبر 1997)

یہ اسلام نہیں

رپورٹ کے مطابق، امریکا کی فوج میں پندرہ ہزار مسلمان ہیں۔ یہ لوگ ایک قسم کے نفسیاتی بحران میں مبتلا ہیں۔ وہ یہ کہ وہ امریکا کی فوج میں شامل ہوکر ایک مسلم ملک عراق کے خلاف جنگ کریں یا نہ کریں۔ بتایا گیا ہے کہ ایک امریکی مسلمان جس کا نام اکبر تھا اور کویت میں امریکی فوج کے ساتھ تھا، اس نے ذہنی پریشانی کے عالم میں امریکی فوجیوں کے ایک کیمپ پر گرینیڈ سے حملہ کردیا اور چھ امریکیوں کو مار ڈالا۔

میرے نزدیک اس معاملہ میں امریکی مسلمانوں کے لیے جو چوائس ہے، وہ یہ نہیں ہے کہ وہ امریکی فوج میں شامل ہوکر مسلم ملک کے خلاف لڑیں یا نہ لڑیں۔ حقیقی چوائس صرف یہ ہے کہ وہ امریکی شہریت کو قبول کریں یا شہریت کو چھوڑ کر امریکا سے باہر آجائیں۔ میرے نزدیک یہ ایک منافقانہ

(double standard) روش ہے کہ امریکا کی شہریت لے کر وہاں کی مادی سہولتوں سے فائدہ اٹھایا جائے اور جب امریکا کو کوئی قومی لڑائی پیش آئے تو اس لڑائی میں امریکا کا ساتھ نہ دیا جائے۔

آج کل اُمّہ کا جو تصور مسلمانوں میں پھیلا ہوا ہے، مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ میرے نزدیک مسلمان اپنے مذہب کے اعتبار سے عالمی امت ہیں۔ مگر وطن کے اعتبار سے ان کی وفاداریاں اسی طرح اپنے وطن کے ساتھ ہونی چاہئیں، جس طرح دوسری قوموں کے لوگ اپنے مذہب کے اعتبار سے الگ تشخص رکھنے کے باوجود وطنی معاملات میں بقیہ اہل وطن کے ساتھ ہوتے ہیں۔ (ڈائری، 26 مارچ 2003)

ایک مثال

بی بی سی لندن پر ہندی خبروں کے پروگرام کے تحت ہر روز ایک آئٹم ہوتا ہے جس کا مستقل عنوان یہ ہے: بات ایک سفر کی

اس آئٹم کے تحت 13 نومبر 2003 کو جو واقعہ بیان کیا گیا وہ یہ تھا۔ سمستی پور (بہار) کے ایک صاحب، مشتاق خان نے بتایا کہ وہ اپنی بہن سے ملنے کے لیے کراچی (پاکستان) گئے۔ یہ سفر انھوں نے ستمبر 1991 میں کیا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ واگہہ بارڈر سے ٹرین کے ذریعہ روانہ ہوئے۔ جب وہ پاکستانی سرحد (اٹاری) پر پہنچے تو بعض مسافروں نے بتایا کہ موجودہ پاکستانی وزیر اعظم نواز شریف نے اعلان کیا ہے کہ ہندوستان سے آنے والے مسافروں کی کسٹم کی چیکنگ نہیں کی جائے گی۔ یہ سن کر مشتاق خان صاحب بہت خوش ہوئے۔

مگر جب 11 ستمبر 1991 کو ان کی ٹرین لاہور ریلوے اسٹیشن پر پہنچی تو معاملہ بالکل مختلف تھا۔ یہاں کسٹم کا سرکاری عملہ ان لوگوں کے اوپر ٹوٹ پڑا اور نہایت سختی کے ساتھ ان کی جانچ کرنے لگا۔ مشتاق خان صاحب نے پریشان ہو کر کچھ کہا تو کسٹم کا ایک آدمی ان پر برس پڑا۔ اس نے تحقیری انداز میں کہا کہ تم تو شکل ہی سے ہندوستانی نظر آتے ہو۔ مشتاق خاں صاحب نے اس کا جواب ان الفاظ میں دیا

کہ ہم ہندوستانیوں کے چہرے سے نور ٹپکتا ہے، اور تم پاکستانیوں کے چہرے سے پھٹکار ٹپکتی ہے۔

یہ واقعہ ہندوستان کے عام مسلمانوں کے جذبات کو بتاتا ہے۔ عام مسلمان جو ہندوؤں کے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں ان کے دلوں میں ہندوستان کے بارے میں اسی قسم کے جذبات ہیں۔ مگر مسلمانوں کے نام نہاد لیڈر اور مسلمانوں کی نام نہاد اردو صحافت کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ انھی لوگوں کی وہ منفی تحریریں اور منفی تقریریں وہ مسئلہ پیدا کرتی ہیں جس کی بنا پر کٹر ہندوؤں کو یہ کہنے کا موقع ملتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان محب وطن نہیں۔ (ڈائری، 13 نومبر 2003)

برادرانِ وطن کے ساتھ حسنِ سلوک

دو صاحبان ملاقات کے لیے آئے۔ یہ مسلمان تھے، اور برطانیہ میں رہتے ہیں۔ گفتگو کے دوران میں نے ان سے کہا کہ مسلمان کو اپنے وطن سے محبت ہونا چاہیے۔ برطانی مسلمانوں کو برطانیہ سے اور امریکی مسلمانوں کو امریکہ سے۔ انھوں نے کہا کہ اگر وہاں کے لوگ ہم سے نفرت کریں، تب بھی ہم ان سے محبت کریں۔ میں نے کہا کہ ہاں۔ پھر میں نے ان کو یہ حدیث سنائی:

> لَا تَكُونُوا إِمَّعَةً، تَقُولُونَ: إِنْ أَحْسَنَ النَّاسُ أَحْسَنَّا، وَإِنْ ظَلَمُوا ظَلَمْنَا، وَلَكِنْ وَطِّنُوا أَنْفُسَكُمْ، إِنْ أَحْسَنَ النَّاسُ أَنْ تُحْسِنُوا، وَإِنْ أَسَاءُوا فَلَا تَظْلِمُوا (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2007)۔ یعنی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم لوگ اِمَّعہ نہ بنو، یہ کہنے لگو کہ لوگ اچھا سلوک کریں گے تو ہم بھی اچھا سلوک کریں گے۔ اور لوگ ظلم کریں گے تو ہم بھی ان کے ساتھ ظلم کریں گے۔ بلکہ اپنے آپ کو اس کا خوگر بناؤ کہ لوگ اچھا سلوک کریں تب بھی تم اچھا سلوک کرو اور لوگ برا سلوک کریں تو تم ان کے ساتھ ظلم نہ کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی اخلاق ٹٹ فار ٹیٹ (tit for tat) کا اخلاق نہیں۔ اسلامی اخلاق یک طرفہ حسنِ سلوک کے اصول پر مبنی ہے۔ (ڈائری، 28 جولائی 2011)

نیشنل کیریکٹر

بھارتیہ ودیا بھون ہندستان کا ایک بہت بڑا تعلیمی اور اشاعتی ادارہ ہے۔ اس کی دعوت پر نومبر 1993 میں میرا ایک سفر بمبئی (موجودہ ممبئی) کے لیے ہوا۔ اس سفر کا مقصد یہ تھا کہ بھارتیہ ودیا بھون نے ایک خصوصی جلسہ منعقد کیا تھا، جس میں مجھے شرکت اور خطاب کی دعوت دی گئی تھی۔ اس جلسے میں، میں نے اپنی آدھ گھنٹے کی تقریر میں دو باتوں پر خاص طور پر زور دیا۔ ایک، ہندو مسلم میل ملاپ۔ اور دوسرے، نیشنل کیریکٹر۔ ہندو مسلم میل ملاپ کی اہمیت کو بتاتے ہوئے میں نے کہا کہ اسی اتحاد کی خاطر مہاتما گاندھی نواکھلی (بنگلہ دیش) چلے گئے تھے۔ وہاں کے قیام کے دوران 5 دسمبر 1946ء کو انھوں نے لکھا کہ میرا موجودہ مشن میری زندگی کا بہت مشکل اور بہت پیچیدہ مشن ہے۔ میں اس کی خاطر سب کچھ جھیلنے کے لیے تیار ہوں۔ یہ کرو یا مرو کا امتحان ہے۔ اس وقت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں امن کے ساتھ رہنا سیکھیں۔ ورنہ میں اسی راہ میں مرجاؤں گا:

> The present mission is the most complicated of all I have undertaken in my life…I mean to do or die here. "To do" means to restore amity between Hindus and Muslims; or I should perish in the attempt. (*The Collected Works of Mahatma Gandhi*, Vol. 86, pp. 197-198)

نیشنل کیریکٹر کے سلسلہ میں میں نے کہا کہ نیشنل کیریکٹر یہ ہے کہ نیشن (ملک) کے انٹرسٹ کو سپریم بنایا جائے۔ جہاں ملک کا انٹرسٹ آجائے وہاں ذاتی انٹرسٹ کو سکنڈری بنا دیا جائے۔

(بمبئی کا سفر، نومبر 1993)

سچی دیش بھکتی

کچھ لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران دیش بھگتی کا ذکر ہوا۔ یہ سوال آیا کہ سچا دیش بھگت کون ہے اور اس کی پہچان کیا ہے۔

میں نے پوچھا، کیا آپ جانتے ہیں کہ ماں کو بھی اپنے بیٹے سے محبت ہوتی ہے، اور تاجر کو بھی اپنے گاہک سے محبت ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہاں، یہ تو سبھی جانتے ہیں۔ پھر میں نے پوچھا کہ کیا آپ کسی ماں کو جانتے ہیں جو اپنے بیٹے کی محبت میں روئی ہو۔ انھوں نے کہا کہ ایسی تو سبھی مائیں ہوتی ہیں۔ کسی ماں کے بیٹے پر کوئی سنکٹ پڑے تو اس کی خبر جب ماں کو ہوگی تو اس کی آنکھ سے آنسو ضرور نکل آئے گا۔ میں نے کہا کہ اچھا یہ بتائیے کہ کیا آپ ایسے تاجروں کو جانتے ہیں جو اپنے گاہک کے لیے روتے ہوں۔ انھوں نے جواب دیا کہ ایسا کوئی تاجر تو ہم کو نہیں معلوم۔

میں نے کہا کہ اب میں سوال بدل کر ایک اور بات آپ سے پوچھتا ہوں۔ آپ سب لوگ الگ الگ پارٹیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر پارٹی کے لیڈر اپنے بارے میں دیش بھگت ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ کیا آپ میں سے کوئی بتا سکتا ہے کہ اس کی پارٹی کے لیڈروں میں کون کون لیڈر ہیں جو دیش کی حالت پر روتے ہوں۔ سب نے کہا کہ ایسا کوئی لیڈر ہم کو نہیں معلوم۔ دیش بھگتی کا دعویٰ تو سبھی کرتے ہیں مگر دیش کے لیے کوئی بھی نہیں روتا۔

میں نے کہا کہ اب میرا فیصلہ سنیے۔ جو آدمی دیش کے درد میں روئے وہ سچا دیش بھگت ہے۔ اور جو آدمی صرف دیش کے نام پر تقریر کرے وہ بناوٹی دیش بھگت۔ (بمبئی کا سفر، نومبر 1993)

قومی شعور اور وطن کی تعمیر

دیش کی ترقی کے لیے بلا شبہ ایک پروگرام درکار ہے۔ مگر پروگرام سے پہلے وہ افراد درکار ہیں جو اس پروگرام کو دل کی آمادگی کے ساتھ اختیار کریں۔ میں نے کہا کہ اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں میں یہ شعور پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ اختلافات ہر سماج میں ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اختلاف اور شکایت کے باوجود مل جل کر رہنا سیکھیں۔ ہمارے دیش کے مسئلہ کا حل وہی ہے جو کسی نے کہا کہ اختلافی باتوں کو پر امن طور پر طے کر لینا:

Peaceful resolution of conflicts.

اس مقصد کے لیے ہمیں intensive awareness programme جاری کرنا ہوگا۔
(سیوا گرام کا سفر، مارچ 1993)

اتحاد اور ایثار

بھارت وکاس پریشد کی دعوت پر 31 مارچ 1995 کو بھیل واڑہ، راجستھان کا سفر ہوا۔ یہ ایک غیر سیاسی ادارہ ہے۔ یہ لوگ تعمیری کاموں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کا ماٹو ہے: راشٹر نرمان — ویکتی نرمان۔ یعنی، فرد کی تعمیر سے ملک کی تعمیر ہوتی ہے۔ ان کے پروگراموں کے چار اجزاء یہ ہیں: سیوا، سنسکار، سہیوگ، سمپرک۔

سوچنا کیندر (انفارمیشن سنٹر) میں نوجوانوں کی ایک میٹنگ ہوئی۔ تمہیدی تقریروں کے بعد مجھے موقع دیا گیا۔ میں نے اپنے خطاب میں کہا کہ دو باتیں اگر ہمارے اندر آجائیں تو ملک کی ترقی کو کوئی روک نہیں سکتا۔ آج کل یہ حال ہے کہ لوگ دیش سے صرف لینا جانتے ہیں، دیش کو دینا نہیں جانتے۔ یہ مزاج نہ صرف ملک کے لیے نقصان دہ ہے، بلکہ طویل مدت کے اعتبار سے خود افراد کے لیے نقصان کا باعث ہے۔ ہمیں یہ کرنا ہوگا کہ ذاتی مفاد کے مقابلہ میں دیش کے مفاد کو اونچا رکھیں۔

دوسری چیز یہ ہے کہ اس ملک کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہندو مسلم جھگڑا ہے۔ یہ جھگڑا تمام تر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ ایمرجنسی کے زمانہ میں جب ہندوؤں اور مسلمانوں کو گرفتار کرکے جیل میں ڈال دیا گیا اور وہاں دونوں ایک ساتھ رہے تو ہر ایک نے محسوس کیا کہ ایک دوسرے کے بارے میں ان کے خدشے بے بنیاد تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اگر کسی طرح صرف اختلاط بڑھ جائے تو تمام غلط فہمیاں اپنے آپ ختم ہوجائیں گی۔ (راجستھان کا سفر)

ایک سینئر سیٹیزن کی زبانی

میری پیدائش یکم جنوری 1925ء کو یوپی میں ہوئی۔ میں برٹش انڈیا میں پیدا ہوا، اور اب اس کے ایک سینئر سیٹیزن کی حیثیت سے آزاد انڈیا میں پہنچ گیا ہوں۔ میری پیدائش ایک ایسے گھرانے

میں ہوئی، جو فریڈم فائٹر کی حیثیت رکھتا تھا۔ میرے بڑے بھائی اقبال احمد خاں سہیل (ایم اے، ایل ایل بی) ایڈوکیٹ (1884-1955) ایک شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی ایک نظم میں کہا تھا:

غلط ہے یہ کہ فقط ہندوؤں کا لیڈر تھا　　　کہ تھا تمام جہاں بھر کا رہنما گاندھی

اقبال احمد خاں سہیل نے 1936 کے یوپی کے الیکشن میں حصہ لیا تھا، اور الیکشن جیت کر یوپی اسمبلی کے ممبر بنے تھے۔ اس کے بعد جب میں بڑا ہوا، تو مجھے سوامی وویکانندا (1863-1902) کی کتاب لیٹرس آف وویکانندا پڑھنے کو ملی۔ اس کتاب کے لیٹر نمبر 271 میں سوامی وویکانند نے اپنے ایک فرینڈ کو ایک خط مورخہ 10 جون 1898ء میں لکھا تھا۔ اس خط میں سوامی وویکانند نے آزاد انڈیا کے بارے میں اپنے ویزن کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا:

> For our own motherland a junction of the two great systems, Hinduism and Islam—Vedanta brain and Islam body—is the only hope. I see in my mind's eye the future perfect India rising out of this chaos and strife, glorious and invincible, with Vedanta brain and Islam body. (*Letters of Swami Vivekananda*, Letter No. 271, p. 427)

انھیں سہانی یادوں کے ساتھ میرے دن گزرتے رہے۔ میں اپنے دائرے میں آزادی کی سرگرمیوں میں شریک رہا۔ مثلاً میں نے آزادی سے پہلے مئو (یوپی) جا کر جواہر لال نہرو (1889-1964) کی تقریر سنی۔ مجھے یاد ہے کہ لوگ ٹرینوں اور بسوں کی چھت پر بیٹھ کر مئو پہنچے تھے۔ اسی طرح میں نے پھولپور (اعظم گڑھ) کے ایک جلسہ میں شریک ہو کر سبھاش چندر بوس (1897-1945) کی تقریر سنی۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ سبھاش چندر بوس نے آزاد ہند فوج 1942 میں بنائی تھی۔ ان کا نعرہ یہ تھا:

Give me blood, and I will give you freedom.

اسی طرح میں نے ایک سوشلسٹ اجتماع (gathering) میں شریک ہو کر جے پرکاش نارائن (1902-1979) کی تقریر سنی۔ یہ جلسہ اعظم گڑھ میں ہوا تھا۔ جیسا کہ معلوم ہے جے پرکاش نارائن بعد کو لوک نائک کے خطاب سے مشہور ہوئے۔ اس طرح میری نوجوانی کے دن گزر رہے تھے۔ یہاں تک کہ 15 اگست 1947ء کا دن آ گیا۔ 15 اگست 1947ء کی رات کو میں نے وہ

تاریخی تقریر تو نہیں سنی، جس میں اس وقت کے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن (1979-1900) نے رات کو 12 بج کر ایک منٹ پر آل انڈیا ریڈیو سے اعلان کیا تھا:

Today, India is free

میں وائسرائے کی تقریر کو ریڈیو پر تو نہیں سن سکا، لیکن بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح میں نے اگلے دن صبح کو اخبار میں پڑھا۔ 15 اگست 1947ء کو میں اعظم گڑھ میں تھا۔ مجھے یاد ہے کہ رات کے وقت جب میں اپنی قیام گاہ سے باہر نکلا، اور شہر کی سڑکوں پر پہنچا تو میرے چاروں طرف خوشی کے دیے جل رہے تھے۔ پورا شہر روشنی میں ڈوبا ہوا تھا۔

اب وہ روشنی بجھ چکی ہے، لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ ہم سب لوگ مل کر ایک نئے دَور کے آغاز کا دیا جلائیں — وہ ہے انڈیا کی نئی تعمیر کا دَور۔ وہ دَور جس کا خواب سوامی وویکانند نے دیکھا تھا۔ وہ دَور جس کی یاد میں مہاتما گاندھی نے اپنی جان دے دی۔ وہ دَور جس کا آخری صفحہ لکھنے کے لیے شاید انڈیا کا مؤرخ انتظار کر رہا ہے۔

میں اب 90 پلس ہو چکا ہوں۔ لیکن میری امیدیں ابھی تک باقی ہیں۔ میرا معمول ہے کہ میں روزانہ صبح کو اپنے کمرے سے نکل کر باہر بیٹھ جاتا ہوں، اور صبح کے سورج کے نکلنے کا انتظار کرتا رہتا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ 15 اگست پر ہونے والے ایک پروگرام میں مَیں نے کسی شاعر کی زبان سے سنا تھا:

برج محن سے نکلا سورج　　　　روشن اپنا مستقبل ہے

میں روزانہ طلوع سورج (sunrise) کا منظر اس امید سے دیکھتا ہوں کہ شاید آج کی صبح وہی صبح ہو، جس کے اشتیاق میں ایک فریڈم فائٹر نے ایک کتاب لکھی تھی، جس کا ٹائٹل تھا: روشن مستقبل۔ میں ہر دن نکلنے والے سورج کا استقبال ان الفاظ میں کرتا ہوں — وہ صبح کبھی تو آئے گی، وہ صبح کبھی تو آئے گی۔

انڈیا نے پیس فل اسٹرگل (peaceful struggle) کے ذریعے اپنی تاریخی آزادی حاصل کی تھی۔ اب انڈیا کی تعمیر نو کا کام بھی صرف پیس فل اسٹرگل کے ذریعے انجام دیا جا سکتا ہے۔ انڈیا نے پیس فل اسٹرگل کے ذریعے آزادی حاصل کر کے ایک تاریخ بنائی تھی، اب دوبارہ وقت آ گیا

ہے کہ انڈیا کی تعمیر نو کا کام پیس فل اسٹرگل کے ذریعے انجام دیا جائے۔ انڈیا کی طاقت پہلے بھی امن تھی، آج بھی امن (peace) ہے، اور آئندہ بھی امن ہی اس کی طاقت بنی رہے گی۔

15 اگست 2020 کو انڈیا نے اپنا چوہتّرواں (74th) یوم آزادی منایا۔ اب آخری وقت آ گیا ہے کہ ہم آزاد انڈیا کی حیثیت سے اپنا رخ متعین کریں۔ یوم آزادی ہمارے لیے ٹرینڈ سیٹر (trend-setter) ہونا چاہیے۔ موجودہ سال، یعنی 2020ء کو ہمیں ٹرینڈ سیٹر سال کے طور پر منانا چاہیے۔ سوچ سمجھ کر ہمیں آخری طور پر یہ طے کرنا چاہیے کہ آزاد نیشن کی حیثیت سے ہمارا نشانہ کیا ہے۔

سوامی وویکانندا نے کہا تھا کہ انڈیا کے بارے میں ان کا خواب یہ ہے کہ آزادی کے بعد انڈیا اسپریچول سوپر پاور بن کر ابھرے۔ انڈیا پوٹنشل طور پر بلاشبہ اسپریچول سوپر پاور ہے۔ اس پوٹنشل کو ایکچول بنانے کے لیے صرف ایک چیز کی ضرورت ہے، اور وہ ہے جمہوری نظام کے تحت متحد ہو کر کوشش کرنا۔

میں 90 پلس ہوں، اس لحاظ سے مجھے زندگی کا لمبا تجربہ ہوا ہے۔ میں اپنے تجربے کی روشنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ انڈیا کے ڈیولپمنٹ کے لیے صرف ایک ہی ورکیبل ماڈل ہے۔ وہ وہی فطری ماڈل ہے، جس کو امریکن ماڈل کہا جاسکتا ہے۔ امریکن ماڈل فری کمپٹیشن پر بیس (base) کرتا ہے، یعنی ایسا ماحول پیدا کرنا، جس میں میرٹ کی بنیاد پر کسی کو ترقی حاصل ہو، نہ کہ فیور (favour) کی بنیاد پر۔ ترقی کے لیے اصل چیز کمپٹیشن ہے، نہ کہ فیور۔ امریکا میں ہر میدان میں یہ اصول ہے کہ کمپیٹ یا پیرش (compete or perish)، یعنی مقابلہ کرو، یا ختم ہو جاؤ۔ عام زبان میں اس کو کرو یا مرو (do or die) کہا جاتا ہے۔

فطرت کے قانون کے مطابق، اس دنیا میں کوئی گروہ فیور (favour) کے ذریعے ترقی نہیں کرسکتا۔ وہ صرف مقابلہ (competition) میں اپنے آپ کو اہل ثابت کرکے کامیاب ہوسکتا ہے۔ یہ کمپٹیشن ہے، جو انسان کو مین (man) سے اٹھا کر سوپر مین (super-man) بناتی ہے۔ کیوں کہ خالق نے اس دنیا کو چیلنج — رسپانس (challenge-response) کے اصول پر بنایا ہے۔ فرد کی ترقی یا سماج کی ترقی کا راز یہ ہے کہ فطرت کو آزادانہ طور پر کام کرنے کا موقع دیا

جائے۔ اس کے سوا ہر دوسرا اصول انسان کا خود ساختہ اصول ہوگا، جو کبھی عمل میں آنے والا نہیں۔

یہی ماڈل نیچرل ماڈل ہے۔ کمپٹیشن کا ماڈل ماٹیویٹنگ ماڈل (motivating model) ہے۔ اس کے برعکس، نہرو نے رشین ماڈل کو اختیار کیا، جس کو وہ سوشلسٹ ماڈل کا نام دیتے تھے۔ مگر عملاً یہ ماڈل ڈی ماٹیویٹنگ ماڈل (demotivating model) ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اس ماڈل کو اختیار کریں، جو ماٹیویشن پر مبنی ہے، اور اس ماڈل کو مکمل طور پر چھوڑ دیں، جو عملاً ڈی ماٹیویشن کا ماڈل بن جاتا ہے۔ اب آخری وقت آ گیا ہے کہ ہم انڈیا کے ڈیولپمنٹ کی ری پلاننگ کریں۔

انڈیا میں امریکا کے سابق سفیر جان گالبریتھ (John Kenneth Galbraith, 1908-2006) نے ایک مرتبہ اپنے ایک بیان میں کہا تھا— انڈیا ایک فنکشننگ انارکی ہے (India is a functioning anarchy)۔ میں اس بیان کو کریٹیسزم کے طور پر نہیں لیتا، بلکہ چیلنج کے طور پر لیتا ہوں، اور یہ دعا کرتا ہوں کہ انڈیا ایک آئڈیل ڈیموکریسی بنے۔ (الرسالہ، اکتوبر، 2020)

سوال وجواب

سوال

آپ کا ایک خط ’ماہنامہ تذکیر‘ کے مئی 2004 (نیز الرسالہ، مئی 2004) کے شمارے میں شائع ہوا ہے جو آپ نے عبد السلام اکبانی صاحب (ناگپور) کو لکھا ہے۔ اس میں آپ نے اُس تقریر کا حوالہ دیا ہے جو آپ نے دہلی میں کانسٹی ٹیوشن کلب کے ایک سیمینار میں کی۔ اس میں آپ نے دو قومی نظریے کو علامہ اقبال اور جناح صاحب کے ذہن کی پیداوار قرار دیا اور یہ دلیل دی کہ ہر پیغمبر نے اپنے زمانے کے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے ”اے میری قوم“ کہا۔ یعنی حاضرین کا عقیدہ یا مذہب چاہے الگ الگ ہو، ایک بستی یا ایک جغرافیائی وحدت میں رہائش پذیر ہونے کی وجہ سے وہ ایک قوم تھے۔

اس سلسلے میں بندہ کچھ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہے۔ قرآن تو جگہ جگہ ایمان والوں کو یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (اے ایمان والو) اور کفر والوں کو یٰٓاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ (اے کافرو) کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کیا مؤمن اور فاسق برابر ہو سکتے ہیں۔ پھر قرآن خود جواب دیتا ہے ہرگز نہیں (32:18)۔ وہ کہتا ہے تم جس کو پوجتے ہو اُس کو ہمارا رسول نہیں پوجتا اور جس کو وہ پوجتا ہے اُس کو تم نہیں پوجتے۔ ہمارے رسول اور اس کے ساتھیوں کا اپنا دینِ خالص، اور تمہارے لیے تمہارا دین (الکافرون، 109:1-6)۔

قرآن کہتا ہے کہ مسلمین اور مجرمین کو کیا ہم ایک سطح پر رکھیں؟ تمہیں کیا ہو گیا کیسا غلط گمان ہے تمہارا (68:35-36)۔ قرآن میں اللہ کافروں کو حِزْبُ الشَّیْطٰنِ کہتا ہے اور مومنوں کو حِزْبُ اللّٰہِ کہہ کر ان کو انعام کی بشارت دیتا ہے (58:19, 22)۔

اور سورہ التوبہ میں اعلان کرتا ہے کہ مشرکین نجس ہیں اور یہ جو اپنے آپ کو حرم کعبہ کا متولّی سمجھتے تھے ان کو اگلے سال سے حرم کعبہ کے قریب بھی نہ آنے دینا (9:28) اور جو ایمان نہیں لاتے ان سے قتال کریں۔ اور آپ ہیں کہ کافروں اور مومنوں کو ایک ہی قوم ثابت کرنے کی سعی لاحاصل میں ہلکان ہو رہے ہیں۔ (محمد صدیق، اسلام آباد)

جواب

1۔ قرآن سے جب یہ ثابت ہو جائے کہ پچھلے نبیوں نے اپنے غیر مسلم مخاطبین سے کہا تھا کہ: ”اے میری قوم“ (11:89)۔ تو یہی اُسوہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ قرار پائے گا۔ کیوں کہ قرآن میں رسول اللہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تم بھی وہی کرو جو پچھلے انبیاء نے کیا: فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (6:90)۔ یعنی، پس تم بھی ان کے طریقہ پر چلو۔

روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً بھی یہی کیا۔ چنانچہ غزوہ اُحد کے موقع پر آپ کے مخالفین نے آپ کے اوپر پتھر مارا جو آپ کے چہرے پر لگا۔ اس سے آپ کے چہرے سے خون جاری ہو گیا۔ اُس وقت آپ نے ایک پچھلے رسول کے اُسوہ پر عمل کیا۔ عبد اللہ بن مسعود اس واقعے کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يَحْكِي نَبِيًّا مِنَ الْأَنْبِيَاءِ، ضَرَبَهُ قَوْمُهُ وَهُوَ يَمْسَحُ الدَّمَ عَنْ وَجْهِهِ وَيَقُولُ: رَبِّ اغْفِرْ لِقَوْمِي فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3477؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 1792)۔ یعنی، ”میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ رہا ہوں۔ وہ نبیوں میں سے ایک نبی کا حال بیان کررہے ہیں جس کو اُس کی قوم نے مار کر زخمی کیا۔ وہ اپنے چہرے سے خون پونچھ رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے: اے اللہ! تو میری قوم کو معاف فرمادے کیوں کہ وہ جانتے نہیں۔“

اس معاملے میں جو کچھ میں نے کہا ہے وہ نص پر مبنی ہے۔ جب کہ آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ تمام تر قیاس اور استنباط پر مبنی ہے اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ قیاس اور استنباط کے ذریعے کسی نص کی تردید نہیں ہوتی۔

2۔ اس معاملے میں آپ جیسے لوگوں کی اصل مشکل یہ ہے کہ آپ نے انسانیت کو مستقل طور پر دو گروہوں میں بانٹ دیا ہے، مسلم اور کافر۔ اس تقسیم کی بنا پر آپ لوگوں کے نزدیک ایک طرف ابدی معنوں میں ایک قوم، مسلم قوم بن گئی ہے اور دوسری طرف ابدی معنوں میں ایک قوم غیر مسلم قوم۔ یہ تقسیم سراسر غلط ہے۔

نہ مسلمان کسی نسلی گروہ کا نام ہے اور نہ کافر کسی نسلی گروہ کا نام۔ دونوں ہی کا مدار اس پر ہے کہ کس کو معرفتِ خداوندی ملی اور کس کو معرفتِ خداوندی نہیں ملی۔ اس لیے مسلسل ایسا ہوگا کہ مسلمانوں کی بعد کی نسلیں اسلام سے دور ہوتی رہیں گی اور غیر مسلموں میں سے لوگ سچائی کی دریافت کرکے اللہ کے اطاعت گزار بندے بنتے رہیں گے۔

اس لیے یہ بالکل فطری بات ہے کہ قومیت کا مدار مذہب پر نہ ہو، بلکہ ہوم لینڈ پر ہو۔ کیوں کہ مذہب کی تقسیم بدلتی رہتی ہے، جب کہ ہوم لینڈ کی تقسیم عموماً نہیں بدلتی۔

آپ نے اپنے سوال میں جن آیات کا حوالہ دیا ہے، ان کے تفصیلی مطالعہ کے لیے میری تفسیر ”تذکیر القرآن“ اور میری کتاب ”حکمتِ اسلام“ کا چیپٹر ” کفر اور کافر کا مسئلہ“ ملاحظہ فرمائیے۔

نوٹ: یہ مضامین اردو اور انگریزی زبانوں میں کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔

کفر، تکذیب

قرآن میں ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ (5:10)۔ یعنی، اور جنھوں نے کفر کیا اور ہماری نشانیوں کی تکذیب کی، ایسے لوگ دوزخ والے ہیں۔ اس طرح کی آیتوں میں کفر اور تکذیب بآیات اللہ کا کیا مطلب ہے۔ متداول تفسیروں کے مطابق اس قسم کی آیتوں میں کفر سے مراد ہے نبوت کا انکار۔ اب سوال یہ ہے کہ تکذیب آیات کا کیا مطلب ہے۔ اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں ایک ہی حقیقت کو دو پہلوؤں سے بیان کیا گیا ہے۔ کفر سے مراد ہے، نبوت کا بحیثیت عقیدہ انکار، اور تکذیب آیات سے مراد ہے، اس مسئلے پر بیان کردہ دلائل کو خود ساختہ توجیہات کے ذریعے ناقابلِ قبول قرار دینا۔

مثلاً یہ ماننا کہ انبیاء ہمیشہ بنی اسرائیل کی نسل میں پیدا ہوئے۔ اس لیے بنی اسماعیل میں نبی کا پیدا ہونا قابل قبول بات نہیں ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا تو یہود نے آپ کو نبی برحق ماننے سے انکار کردیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اللہ کی طرف سے جو نبی آئے، وہ سب کے سب بنی اسرائیل میں آئے، یعنی قبیلۂ یہود میں۔ پیغمبر عربی اس کے برعکس، بنی اسماعیل میں پیدا ہوئے ہیں، ان کا تعلق بنی اسرائیل سے نہیں ہے۔ اس لیے وہ نبی برحق کے طور پر قابلِ قبول نہیں ہوسکتے۔

اسی طرح یہود کے روایتی عقیدے کے مطابق، ہدایت ایک نسلی حقیقت تھی، یعنی ایک مخصوص نسل میں پیدا ہونے سے آدمی کو ہدایت مل جاتی تھی۔ پیغمبر اسلام نے ہدایت کو ایک پیدائشی چیز کے بجائے، ذاتی انتخاب (choice) کی چیز بتایا۔ یہ بات بھی یہود کے لیے اپنے روایتی عقیدے کے مطابق ناقابلِ فہم تھی۔ اس بنا پر وہ بیک وقت دو جرم کے مرتکب قرار پائے، نبوت کا بطور عقیدہ انکار کرنا، اور اس معاملے میں بیان کردہ دلیل کو نہ ماننا۔ اس بنا پر ان کا کیس کفر کا کیس بھی تھا، اور تکذیب کا کیس بھی۔ مسلمانوں نے اس سے مشابہ یہ غلطی کی کہ انھوں نے سچائی کو اپنے اپنے مسالک اور فرقوں سے منسوب کردیا، اور اس معاملے میں کسی بھی دلیل کو ماننے سے انکار کردیا۔ (الرسالہ، مارچ، 2020)

مٹھاس کا اضافہ

ٹائمس آف انڈیا کے ضمیمہ (The Neighborhood Star) بابت 24-18 مارچ 1989 (صفحہ 6) پر ایک سبق آموز واقعہ شائع ہوا ہے۔ ایران کے پارسی جب پہلی بار ہندستان میں آئے تو وہ ہندستان کے مغربی ساحل پر اترے۔ اس وقت یادورانا گجرات کا راجہ تھا۔ پارسی جماعت کا پیشوا راجہ سے ملا اور اس سے یہ درخواست کی کہ وہ ان لوگوں کو اپنی ریاست میں ٹھہرنے کی اجازت دے۔ راجہ نے اس کے جواب میں دودھ سے بھرا ہوا ایک گلاس پارسی پیشوا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہماری ریاست پہلے ہی سے آدمیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس میں مزید لوگوں کو ٹھہرانے کی گنجائش نہیں۔

پارسی پیشوا نے لفظوں میں اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے صرف یہ کیا کہ ایک چمچہ شکر لے کر دودھ میں ملایا اور گلاس کو راجہ کی طرف لوٹا دیا۔ یہ اشاراتی زبان میں اس بات کا اظہار تھا کہ ہم لوگ آپ کے دودھ پر قبضہ کرنے کے بجائے اس کو میٹھا بنائیں گے، ہم آپ کی ریاست کی زندگی میں شیرینی کا اضافہ کریں گے۔ اس کے بعد راجہ نے انھیں گجرات میں قیام کی اجازت دیدی۔

اس واقعہ پر اب ایک ہزار سال کی مدت گزر چکی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ پارسیوں کے رہنما نے جو بات کہی تھی اس کو پارسی قوم نے پورا کر دکھایا۔ پارسی اس ملک میں مطالبہ اور احتجاج اور ایجی ٹیشن کا جھنڈا لے کر کھڑے نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے اپنی خاموش محنت سے اس ملک کی ترقی میں اضافہ کیا۔ پارسیوں نے دوسروں سے زیادہ محنت کی۔ وہ تعلیم اور تجارت اور صنعت میں آگے بڑھے۔ انھوں نے ملک کی دولت اور ملک کی ترقی کو بڑھایا۔ اس ملک میں جہاں بہت سے لوگ لینے والے گروہ (taker group) کی حیثیت رکھتے ہیں، پارسیوں نے عمل کے ذریعہ اپنے لیے دینے والے گروہ (giver group) کا درجہ حاصل کیا ہے۔ یہی زندگی کا راز ہے۔ اس دنیا میں دینے والا پاتا ہے۔ یہاں اس آدمی کو باعزت جگہ ملتی ہے جو لوگوں کے "دودھ" میں اپنی طرف سے "مٹھاس" کا اضافہ کرے۔ اس کے برعکس، جن لوگوں کے پاس دوسروں کو دینے کے لیے صرف کڑواپن ہو، انھیں بھی اس دنیا میں وہی چیز ملتی ہے جو انھوں نے دوسروں کو دی ہے۔ (الرسالہ، جنوری 1989)

परहेज़गार शब्द का शाब्दिक अर्थ है- सतर्क और डरने वाला। इस्लामी शब्दावली में इसे उस व्यक्ति के रूप में समझा जाता है जो अल्लाह से डरता है। क़ुरआन में ऐसे लोगों की छवि इन शब्दों में प्रस्तुत की गई है:

الَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوا وَّقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلَى رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ

"वे लोग जो देते हैं, और उनका दिल कांपता है, क्योंकि वे जानते हैं कि उन्हें अपने रब की ओर लौटना है।" (मुमिनून 23:60)

जो व्यक्ति इस अर्थ में परहेज़गार होता है, उसका हाल यह होगा कि जब वो कोई अच्छा कर्म करेगा तो उसे गर्व महसूस नहीं होगा। वो अच्छे से अच्छा कर्म करेगा फिर भी वह उसे बहुत छोटा कर्म समझेगा और उसे अपर्याप्त मानेगा। वह अपने कर्म को इतना तुच्छ समझेगा कि अगर अल्लाह उसे स्वीकार कर लेता है, तो यह अल्लाह की कृपा है। उसकी सोच यह होगी कि यह मामला यहीं समाप्त नहीं होता, बल्कि उसकी अंतिम उपस्थिति अल्लाह के पास होगी। अल्लाह ही है जो अगर उसके कार्य को मूल्यवान मानते हैं तो उसका कार्य मूल्यवान है, अन्यथा उसका कार्य कोई महत्व नहीं रखता।

ऐसे व्यक्ति का हाल यह होता है कि एक ओर वह अच्छा कार्य कर रहा होता है, और दूसरी ओर, उसकी आँखों से विनम्रता के आँसू बह रहे होते हैं। सच्चाई यह है कि यही विनम्रता का एहसास किसी कार्य को स्वीकार्य बनाता है। जिस कार्य में विनम्रता की भावना नहीं होती, वह कार्य कभी स्वीकार्य नहीं हो सकता। अल्लाह की दृष्टि में मात्रा का महत्व नहीं है, बल्कि गुणवत्ता का महत्व है। अल्लाह किसी व्यक्ति के कार्य को उसकी बाहरी स्थिति के आधार पर नहीं देखेगा, बल्कि यह देखेगा कि उस कार्य को करने वाले ने कौन सी भावना के साथ उसे किया है।

आकर्षित कर लेता है। इसी प्रकार, जो व्यक्ति अपने भीतर कोई ख़ास गुण रखता हो, वह भी तुरंत लोगों की दृष्टि में आ जाता है और समाज में उसे ख़ास स्थान प्राप्त हो जाता है।

ख़ास गुण किसी भी व्यक्ति की संभावित क्षमता (potential) को वास्तविक क्षमता (actual) में परिवर्तित करने का नाम है। हर व्यक्ति प्राकृतिक रूप से अपने भीतर कोई न कोई अतिरिक्त योग्यता (additional quality) लेकर जन्म लेता है। अपनी इस विशेष योग्यता को पहचानिए और विशेष परिश्रम के माध्यम से इसे विकसित कीजिए। इसके बाद आप एक ख़ास क्षमता के मालिक बन जाएँगे। और जो व्यक्ति किसी ख़ास योग्यता का मालिक होता है, वह स्वतः ही समाज में मान्यता प्राप्त कर लेता है।

वास्तविकता यह है कि जन्म से ही प्रत्येक व्यक्ति का एक ख़ास व्यक्तित्व होता है। लेकिन यह ख़ास व्यक्तित्व हमेशा संभावित होती है। इसे वास्तविक बनाना स्वयं व्यक्ति का कार्य है। प्रत्येक स्त्री और पुरुष को चाहिए कि वह अपनी प्राकृतिक संभावनाओं को पहचाने और अपनी समस्त ऊर्जा लगाकर इस संभावना को वास्तविकता में परिवर्तित करे।

इसी प्रक्रिया में किसी व्यक्ति की ख़ास सफलता का रहस्य छिपा हुआ है। इसी कार्य में असफल होना असफलता कहलाता है, और इसी कार्य में सफल होना सफलता।

स्वीकार करने की शर्त

किसी अच्छे कार्य की स्वीकृति की शर्त क्या है, इसे क़ुरआन की सूरह नंबर 5 में इन शब्दों में व्यक्त किया गया है:

إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ

"अल्लाह केवल परहेज़गारों से ही स्वीकार करता है" (5:27).

माहनामा अल-रिसाला ईमान की वृद्धि के लिए एक दास्तरख़्वान (डाइनिंग टेबल) है। अल-रिसाला के हर पन्ने का उद्देश्य यह होता है कि वह आपको मारिफ़त का आहार प्रदान करे। वह आपके दिल में अल्लाह और आख़िरत की भावना को जागृत करे। यही अल-रिसाला का वास्तविक उद्देश्य है।

जिस व्यक्ति ने अल-रिसाला से यह मारिफ़त का आहार प्राप्त किया, वही वास्तव में अल-रिसाला को पढ़ने वाला है। और जिसने इससे यह आहार प्राप्त नहीं किया, उसने अल-रिसाला को पढ़ा ही नहीं।

अल-रिसाला को केवल जानकारी के लिए पढ़ना, अल-रिसाला के साथ ज़ुल्म करने के समान है।

ऐसा व्यक्ति न तो अल-रिसाला के साथ न्याय करता है और न ही स्वयं के साथ।

ख़ास योग्यता

हज़रत अली बिन अबी तालिब (निधन: 661 ईस्वी) इस्लामी इतिहास की एक महान शख़्सियत माने जाते हैं। बुद्धिमत्ता और ज्ञान की दृष्टि से उनका स्थान बहुत ऊँचा है। उनके कथनों और भाषणों को संकलित कर एक स्वतंत्र पुस्तक तैयार की गई है, जिसका नाम नहजुल बलाग़ा (Nahjul Balagha) है।

हज़रत अली बिन अबी तालिब के कथनों में से एक प्रसिद्ध कथन यह है:

"قيمة المرء ما يحسنه"

(अर्थ: मनुष्य का मूल्य उसकी ख़ास योग्यता में निहित है।)

"The value of a person lies in excellence."

समान कद-काठी के लोगों में यदि कोई व्यक्ति अन्य की तुलना में अधिक ऊँचा हो, तो वह लोगों को दूर से ही दिखाई देगा। ऐसा व्यक्ति तुरंत लोगों का ध्यान

(informative) पत्रिका है। हमें किसी और पत्रिका में ऐसी जानकारी नहीं मिलती।

फिर मैंने पूछा कि आप अल-रिसाला के किसी अंक को कितनी बार पढ़ते हैं? उन्होंने कहा कि एक बार।

मैंने कहा कि जिस व्यक्ति ने अल-रिसाला को केवल एक बार पढ़ा, उसने अल-रिसाला को वास्तव में पढ़ा ही नहीं!

क्योंकि आप माहनामा अल-रिसाला को केवल एक बार पढ़ते हैं, इसलिए आप इसे अब तक समझ नहीं सके। आपने केवल अल-रिसाला की लाइनों (lines) को पाया है, लेकिन आपने अब तक इसके मायने (between the lines) को नहीं पाया।

फिर मैंने कहा कि माहनामा अल-रिसाला कोई जानकारी देने वाली पत्रिका नहीं है, बल्कि मारिफ़त (आध्यात्मिक ज्ञान) की पत्रिका है। अल-रिसाला में जो जानकारी होती है, वह अपने आप में लक्ष्य नहीं होती, बल्कि उसका एक उच्च उद्देश्य होता है। यह उद्देश्य तवस्सुम (क़ुरान,15:75) है— यानी जानकारी के माध्यम से आध्यात्मिक ज्ञान (मारिफ़त) और अर्थपूर्ण सोच को विकसित करना।

असल में, इस दुनिया में हमें दो प्रकार के खाद्य पदार्थों की आवश्यकता होती है—

1. भौतिक आहार (material dose) जो हमारे शरीर को स्वस्थ रखता है।
2. मारिफ़त का आहार (spiritual dose) जो अल्लाह पर ईमान (आस्था) को सशक्त बनाता है।

क़ुरआन इसे इज़दियाद-ए-ईमान (ईमान में वृद्धि) कहता है (48:4)।

माहनामा अल-रिसाला का लक्ष्य इसी इज़दियाद-ए-ईमान की तर्बियत देना है।

समय आ गया है। ऐसी मृत्यु को लोग एक स्वाभाविक घटना समझते हैं और इससे कोई सबक नहीं लेते।

दूसरी मृत्यु वह होती है जो अनपेक्षित होती है। इस प्रकार की मृत्यु में ऐसा होता है कि मरने वाला अभी युवा अवस्था में होता है, वह पूरी तरह स्वस्थ होता है और अपने कार्यों में व्यस्त रहता है, लेकिन अचानक उसकी मृत्यु हो जाती है। आमतौर पर इसे असमय मृत्यु (untimely death) कहा जाता है, लेकिन वास्तव में यह असमय मृत्यु नहीं होती, बल्कि यह याद दिलाने वाली मृत्यु (reminder death) होती है। यह एक चेतावनी देने वाली मृत्यु होती है ताकि लोग इसे देखकर अपनी ज़िंदगी को सुधार लें और मृत्यु को याद रखें।

जो घटना स्वाभाविक रूप से होती है, उसे लोग एक सामान्य घटना मानते हैं और उस पर विचार नहीं करते। लेकिन जो घटना असामान्य रूप से या अप्रत्याशित रूप से होती है, वह लोगों के लिए एक झटका साबित होती है। ऐसी घटनाएँ लोगों को सोचने पर मजबूर कर देती हैं।

इस प्रकार की मृत्यु एक चेतावनी की तरह होती है, जैसे किसी को जगाने के लिए बजने वाली अलार्म घड़ी। यह पुकारती है— "सोने वालो, जागो! अब ग़फ़लत (लापरवाही) का समय समाप्त हो चुका है!"

आम मृत्यु एक मौन संदेश होती है, लेकिन इस प्रकार की मृत्यु बोलता हुआ संदेश होती है।

मारिफ़त या जानकारी

एक शिक्षित मुसलमान से मुलाक़ात हुई। उन्होंने बताया कि वे नियमित रूप से माहनामा (मासिक) अल-रिसाला पढ़ते हैं। मैंने उनसे पूछा कि अल-रिसाला से आपने क्या हासिल किया? उन्होंने कहा कि अल-रिसाला बहुत ज्ञानवर्धक

यह स्थिति पृथ्वी पर हर प्रकार के जीवन के लिए एक गंभीर ख़तरा होगी। कोई भी मानव प्रयास इस तबाही को रोकने में सक्षम नहीं होगा। प्रत्यक्ष या अप्रत्यक्ष रूप से इसका प्रभाव पूरी मानवता तक पहुंचेगा।

स्थिति यह दर्शा रही है कि बहुत जल्द वह समय आने वाला है, जब यह वर्तमान संसार समाप्त हो जाएगा और एक नया संसार अस्तित्व में आएगा, जहां अल्लाह का न्याय (Divine Justice) स्थापित होगा। वहां अच्छे लोगों को स्वर्ग (जन्नत) में प्रवेश मिलेगा और बुरे लोगों को नरक (जहन्नम) की यातनाओं में डाल दिया जाएगा।

अब अंतिम समय आ चुका है कि प्रत्येक जीवित पुरुष और महिला आने वाले न्याय के दिन (Day of Judgement) के लिए तैयारी कर लें, जो निश्चित रूप से आएगा और आने के बाद फिर लौटने वाला नहीं।

याद दिलाने वाली मौत

नसीर अहमद खान बनारसी गुडवर्ड बुक्स और अल-रिसाला बुक सेंटर के एक सदस्य थे। 16 मार्च 2008 को दिल्ली में उनका निधन हो गया। निधन के समय उनकी उम्र लगभग 50 वर्ष थी। उस समय वे पूरी तरह स्वस्थ थे। ज़ाहिर तौर पर मृत्यु के कोई संकेत नहीं थे, लेकिन 16 मार्च को उनके साथ एक हादसा पेश आया और अचानक उनकी मृत्यु हो गई।

मृत्यु दो प्रकार की होती है— एक अपेक्षित मृत्यु (expected death) और दूसरी अनपेक्षित मृत्यु (unexpected death)।

अपेक्षित मृत्यु वह होती है जब व्यक्ति वृद्ध हो जाता है, बीमारी के कारण बिस्तर पर पड़ जाता है और लोग पहले से ही यह मान लेते हैं कि अब उसका अंतिम

अत्यंत तेज़ी से पिघल रहे हैं, और इसके परिणामस्वरूप समुद्रों के जलस्तर में ख़तरनाक वृद्धि हो रही है। इस प्रक्रिया के कारण जो संचित ऊर्जा (pent-up energy) बाहर निकलेगी, उससे धरती पर भयावह भूकंप आएंगे:

> "A new study has indicated that melting ice sheets can release pent-up energy and trigger massive earthquakes. According to a report in National Geographic News, as a result of global warming, ice sheets are melting worldwide, which is triggering off earthquakes. For the study, the researchers had taken into account a series of large earthquakes that had shook Scandinavia around 10,000 years ago, along faults that are now quiet." (p. 24)

ताज़ा रिपोर्ट के अनुसार, ग्लोबल वार्मिंग के प्रभाव से पृथ्वी के हिमखंड (glaciers) बहुत तेज़ी से पिघल रहे हैं, जिससे विनाशकारी भूकंप आ सकते हैं। इसके परिणामस्वरूप धरती पर भूकंपों की एक शृंखला शुरू हो जाएगी, जैसा कि स्कैंडिनेविया (Scandinavia) क्षेत्र में 10,000 वर्ष पहले हुआ था।

ग्लोबल वार्मिंग और उसके विभिन्न पहलुओं पर व्यापक अध्ययन किया गया है। इस अध्ययन का एक महत्वपूर्ण पहलू यह है कि पृथ्वी के उत्तरी और दक्षिणी ध्रुवों पर पहाड़ों के समान विशाल हिमखंड (glaciers) हैं। इन हिमखंडों के नीचे बड़े-बड़े ज्वालामुखी (volcanoes) दबे हुए हैं। ये ज्वालामुखी अपने भीतर भारी मात्रा में संचित ऊर्जा (pent-up energy) रखते हैं। इन पर जमी बर्फ एक प्राकृतिक ढक्कन की तरह थी, जो इस ज्वालामुखी को फटने से रोक रही थी।

ग्लोबल वार्मिंग के प्रभाव से उत्तरी और दक्षिणी ध्रुवों के ये बर्फीले ढक्कन बहुत तेज़ी से पिघल रहे हैं। उनकी बर्फ पिघलकर समुद्रों में मिल रही है। इस स्थिति से यह गंभीर ख़तरा उत्पन्न हो गया है कि जब ये बर्फीले ढक्कन पूरी तरह से पिघल जाएंगे, तो उनके नीचे छिपे ज्वालामुखी फटकर आग और लावा के रूप में बाहर आ जाएंगे।

पद्धति निःसंदेह एकता और अनुशासन को बढ़ावा देने का सबसे बेहतरीन तरीक़ा है।

नमाज़ का समापन "*अस्सलामु अलैकुम व रहमतुल्लाह*" पर होता है, जिसका अर्थ है कि सभी इंसानों के लिए शांति और दया की भावना लेकर मस्जिद से बाहर आना। इस प्रकार, नमाज़ एक ओर विनम्रता सिखाती है और दूसरी ओर शांतिप्रियता (अमन-पसंदी) को जन्म देती है। ये गुण निःसंदेह इस दुनिया में एक बेहतर समाज बनाने का सबसे प्रभावी साधन हैं।

क़यामत का भूकंप

क़ुरआन में जिस क़यामत की भविष्यवाणी की गई थी, वह अब बिल्कुल निकट प्रतीत होती है। क़ुरआन की सूरह नंबर 99 में यह सूचना दी गई थी कि वह समय आने वाला है, जब धरती एक भयानक भूकंप के द्वारा हिला दी जाएगी—

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا

"जब धरती को ज़ोरदार भूकंप से हिला दिया जाएगा।" (99:1)

वर्तमान समय में ग्लोबल वार्मिंग से संबंधित निरंतर खबरें आ रही हैं, जो क़ुरआन की इस भविष्यवाणी (prediction) की पुष्टि करने वाली हैं। नेशनल ज्योग्राफिक न्यूज़ (National Geographic News) के हवाले से एक रिपोर्ट प्रकाशित हुई थी, जिसे नई दिल्ली के अंग्रेज़ी अख़बार टाइम्स ऑफ इंडिया (16 मार्च 2008) ने निम्नलिखित शीर्षक के अंतर्गत प्रकाशित किया:

"Melting ice sheets can trigger massive earthquakes."

इस रिपोर्ट के अनुसार, एक नए अध्ययन से पता चला है कि उत्तरी और दक्षिणी ध्रुवों (North & South Poles) में विशाल बर्फ़ीले पहाड़ (ice sheets)

नमाज़ और जीवन का निर्माण

नमाज़ अपनी मूल वास्तविकता के अनुसार अल्लाह की इबादत है, लेकिन इसकी व्यवहारिक व्यवस्था इस प्रकार निर्धारित की गई है कि यह इंसान के पूरे जीवन को सकारात्मक रूप से संवारने का ज़रिया बन जाती है। एक दृष्टिकोण से, नमाज़ रब्बानी (ईश्वरीय) प्रशिक्षण है, और दूसरे दृष्टिकोण से यह दुनिया में एक संपूर्ण मानसिक विकास का कोर्स है।

नमाज़ की शुरुआत वुज़ू से होती है, जो एक प्रकार से छोटा स्नान (ग़ुस्ल-ए-स़गीर) है। यह इंसान की पवित्रता (ततहीर) का एक स्थायी साधन है। इसके बाद नमाज़ का पहला कलिमा अल्लाहु अकबर (अल्लाह सबसे बड़ा है) होता है। अज़ान और नमाज़ मिलाकर यह वाक्य प्रतिदिन लगभग तीन सौ बार दोहराया जाता है। अल्लाहु अकबर का एक और अर्थ यह है कि मैं बड़ा नहीं हूँ। इस प्रकार, नमाज़ इंसान के अंदर विनम्रता (तवाज़ु‘) को विकसित करती है, जो निस्संदेह वर्तमान दुनिया में सबसे अधिक मूल्यवान गुणों में से एक है।

नमाज़ को दिन और रात में पाँच निश्चित समयों पर अदा करने का आदेश दिया गया है। यह समय प्रबंधन (टाइम मैनेजमेंट) की शिक्षा देता है। यह एक स्थापित तथ्य है कि इंसान के पास सबसे मूल्यवान चीज़ समय है। समय का सुनियोजित उपयोग हर प्रकार की उन्नति के लिए एक अनिवार्य शर्त है, और नमाज़ इंसान को इसी समय अनुशासन के लिए तैयार करती है।

नमाज़ को जमाअत (समूह) में अदा करने का आदेश दिया गया है, जो एकता (इत्तेहाद) की बेहतरीन तालीम है। जमात के दौरान एक व्यक्ति इमाम के रूप में आगे खड़ा होता है और बाक़ी सभी लोग पंक्ति बनाकर उसके पीछे खड़े होते हैं। इस प्रकार, नमाज़ यह सबक देती है कि अपने में से एक को आगे करके, बाक़ी सभी को पीछे की पंक्ति (back seat) में आ जाना चाहिए। यह

नकारात्मक भावना पाले रहते हैं। आज की दुनिया में पूरी तरह सकारात्मक सोच रखने वाला व्यक्ति मिलना मुश्किल है।

इस तरह की सोच व्यक्ति के अंदर नकारात्मक व्यक्तित्व (negative personality) पैदा करती है, जो किसी भी महिला या पुरुष के लिए आत्म-हत्या से कम नहीं। जहां सामान्य आत्म-हत्या शारीरिक (physical suicide) होती है, वहीं नकारात्मक सोच निःसंदेह मानसिक आत्म-हत्या (psychological suicide) है।

अगर इस बारे में लोगों से पूछताछ की जाए, तो यह बात सामने आती है कि उनकी शिकायतें अक्सर किसी ऐसी घटना पर आधारित होती हैं, जिनका संबंध भूतकाल से है। लोगों की यह आदत विनाशकारी होती है कि जब भी उनके साथ कोई अप्रिय घटना घटती है, तो वे इसे दूसरों के साथ साझा करते हैं और हमेशा इसे अपनी स्मृति (memory) में जीवित रखते हैं। यही आदत उनके अंदर नकारात्मक व्यक्तित्व के निर्माण का सबसे बड़ा कारण बन जाती है।

हर व्यक्ति को चाहिए कि जब भी उसके साथ कोई अप्रिय घटना घटे, तो वह उसी समय उसे भुला दे। उसे दूसरों से उसका ज़िक्र नहीं करना चाहिए, बल्कि यह कोशिश करनी चाहिए कि उस अप्रिय घटना में कोई सुखद पहलू खोजे। इस तरह वह एक नकारात्मक अनुभव को सकारात्मक अनुभव में बदल सकता है। ठीक वैसे ही जैसे एक यात्री के पैर में कांटा चुभ जाए, तो वह तुरंत उस कांटे को निकालकर बाहर फेंक देता है और उसे अपनी जीवित यादों का हिस्सा नहीं बनाता।

समझदार वही है जो भूतकाल की कड़वी यादों को भुला देता है। वह अपने मन को भूतकाल की अप्रिय यादों का जंगल नहीं बनने देता। इस दुनिया में सफल जीवन जीने का यही एकमात्र तरीक़ा है।

हक़ीक़त-पसंदाना क़दम, या छलांग

एक व्यक्ति ने एक दुकान खोली जिससे उनकी रोज़मर्रा की ज़रूरतें पूरी हो जाती थीं। मगर उन्होंने अपने खर्चों में इज़ाफा कर लिया, जिससे मुश्किलें बढ़ गईं। उन्होंने बैंक से कर्ज़ लिया ताकि आमदनी बढ़ सके, लेकिन कर्ज़ ने उनकी समस्याएँ और बढ़ा दीं। यह उनके लिए एक छलांग साबित हुई, जो नतीजे के लिहाज़ से उलटी पड़ी। यदि वे अपने खर्चों पर काबू करते और धीरे-धीरे मेहनत कर तरक्की की कोशिश करते, तो कुछ सालों में कामयाब हो सकते थे। मगर अचानक तरक्की की कोशिश ने समस्या को हल करने के बजाय और बढ़ा दिया।

छलांग का यह तरीका जैसे व्यक्ति के लिए नुक़सानदायक है, वैसे ही यह कौमों के लिए भी हानिकारक साबित होता है। 2003 में इराक पर अमेरिका का हमला भी इसी तरह की छलांग थी। अमेरिका के लिए यह हमला उलटा साबित हुआ और उसके लिए कठिनाइयों का कारण बन गया। दो साल पहले, मैंने इसी विषय पर टाइम्स ऑफ इंडिया में एक इंटरव्यू में कहा था कि— "अमेरिका की यह आक्रामकता उसके लिए उलटा नतीजा साबित होगी।"

काम का सही तरीका यह है कि हकीकत पसंदाना (यथार्थवादी) योजना के साथ कदम उठाए जाएँ, न कि भावनाओं के अधीन जाकर छलांग लगाई जाए। समझदारी से किए गए काम हमेशा कामयाब होते हैं, जबकि भावनाओं में किए गए काम का परिणाम अक्सर असफलता होता है।

भूतकाल में जीना

अगर लोगों से बात की जाए तो अक्सर देखा जाता है कि अधिकतर लोग, बल्कि शायद सभी लोग किसी न किसी के खिलाफ़ कोई शिकायत या

तामीर (निर्माण) का नतीजा होती है। इस दृष्टिकोण से यह कहना सही होगा कि इंसान पचास प्रतिशत अल्लाह द्वारा निर्मित है और पचास प्रतिशत खुद का निर्माण है।

इंसान के अंदर हर तरह की क्षमता स्वाभाविक रूप से होती है, लेकिन ये क्षमताएँ उसमें संभावित रूप (potential) में होती हैं। इन क्षमताओं को वास्तविकता (actual) में लाना इंसान का अपना काम है। यह एक शानदार अवसर है जो हर व्यक्ति को मिलता है। यही इंसान की ज़िम्मेदारी है कि वह अपनी संभावनाओं को वास्तविकता में बदल दे, अन्यथा एक असफल इंसान के रूप में मृत्यु को प्राप्त करे।

संभावनाओं को वास्तविकता में बदलना एक बराबर चलने वाली प्रक्रिया है, जो जीवनभर चलती रहती है। इस प्रक्रिया की शुरुआत गहरे चिंतन-मनन से होती है। गहरे चिंतन के ज़रिए इंसान सच्चाई तक पहुँचता है। इसके बाद इंसान को हर दिन आत्ममंथन (introspection) करना होता है। उसे अपनी कमज़ोरियों और त्रुटियों की पहचान करनी होती है और उन्हें सुधार कर अपने अंदर मानसिक और आध्यात्मिक विकास की प्रक्रिया को जारी रखना होता है।

शख्सियत की तामीर (व्यक्तित्व निर्माण) की इस प्रक्रिया को इंसान खुद अंजाम देता है, लेकिन इस प्रक्रिया को सही तरीके से जारी रखने के लिए उसे लगातार अल्लाह की मदद की ज़रूरत होती है। यह मदद दुआ के माध्यम से मिलती है। जो व्यक्ति दुआ के साथ जीता है, वही अपनी शख्सियत के निर्माण में कामयाब होता है। दुआ के बिना यह काम मुकम्मल नहीं हो सकता। इंसान जब पैदा होता है, तो वह कच्चे लोहे की तरह होता है। हर व्यक्ति को अपने कच्चे लोहे को तरक्की देकर स्टील बनाना होता है। यह कार्य हर किसी के लिए अनिवार्य है।

भौतिक तरक्की, रूहानी मौत

नई दिल्ली के अंग्रेज़ी अख़बार 'द हिंदू' के 2 सितंबर 2008 के अंक में एक शिक्षाप्रद रिपोर्ट छपी, जो भारत के मशहूर खिलाड़ी अभिनव बिंद्रा के बारे में थी। अभिनव बिंद्रा ने अगस्त 2008 में बीजिंग (चीन) में हुए ओलंपिक खेलों में शूटिंग में गोल्ड मेडल जीता। इस रिपोर्ट का शीर्षक था— "मैं एक हारा हुआ इंसान हूँ"।

रिपोर्ट के अनुसार, अभिनव बिंद्रा ने कहा कि उन्हें लगता है कि वे ज़िंदगी में एक हारे हुए व्यक्ति हैं, क्योंकि उन्होंने शूटिंग के सिवा कुछ नहीं किया। उन्होंने बीबीसी के कार्यक्रम "एक मुलाक़ात" में कहा, "मैंने अपनी पूरी ज़िंदगी में बस शूटिंग की है। मैंने ज़िंदगी में और कुछ नहीं किया। मैं अपने आपको एक हारा हुआ इंसान मानता हूँ। मैं बस सोता हूँ, दौड़ता हूँ और शूटिंग के अलावा कुछ नहीं करता। खेल ज़िंदगी का केवल एक हिस्सा है। जीवन में और भी कई चीजें हैं, लेकिन मैंने और कुछ नहीं किया।"

इंसानी शख्सियत के दो हिस्से होते हैं—माद्दी (भौतिक) हिस्सा और रूहानी (आध्यात्मिक) हिस्सा। यदि कोई व्यक्ति केवल अपने भौतिक हिस्से को संतुष्ट करता है, तो वह इसी तरह की कमी और निराशा का अनुभव करता रहेगा। लेकिन यदि वह अपने रूहानी हिस्से को भी पोषित करता है, तो उसे कभी भी ऐसी निराशा महसूस नहीं होगी।

शख्सियत की तामीर (व्यक्तित्व निर्माण)

अल्लाह इंसान का ख़ालिक़ (सृजनकर्ता) है। मानसिक और शारीरिक रूप से इंसान जो कुछ भी है, वह पूरी तरह से अल्लाह की रचना का नतीजा है। लेकिन इस दुनिया में इंसान की जो शख्सियत बनती है, वह खुद उसकी अपनी

धन पर्याप्त नहीं है

अमेरिका के बिल गेट्स को सॉफ्टवेयर दिग्गज (software giant) कहा जाता है। उनके पास कोई बड़ी शैक्षिक डिग्री नहीं है। उन्होंने हार्वर्ड यूनिवर्सिटी में पढ़ाई की थी, लेकिन बीच में ही छोड़ दी, फिर भी वे धरती के सबसे धनी व्यक्ति बन गए। 1999 में उनकी संपत्ति का अनुमान सौ बिलियन डॉलर से अधिक था।

उन्होंने कंप्यूटर प्रौद्योगिकी में कई उपलब्धियाँ हासिल कीं, और दुनिया भर में उनका व्यवसाय इतना बढ़ा कि उन्हें "कंप्यूटर किंग" कहा जाने लगा। लेकिन यह समृद्धि उन्हें आंतरिक शांति नहीं दे सकी।

इसलिए उन्होंने मानवता की सेवा (philanthropy) को अपने जीवन का नया उद्देश्य बनाया। उन्होंने "बिल एंड मेलिंडा गेट्स फाउंडेशन" की स्थापना की और अपनी संपत्ति का आधा हिस्सा इसमें दान कर दिया। 27 जून 2008 को, 52 वर्ष की आयु में उन्होंने कंप्यूटर व्यवसाय से ख़ुद को अलग करने का एलान कर दिया।

असल में, कोई भी भौतिक सुविधा या प्रगति व्यक्ति को सच्ची शांति नहीं दे सकती। इस संसार को उसके सृजनकर्ता ने इस उद्देश्य के लिए नहीं बनाया है कि यहाँ व्यक्ति अपनी सभी इच्छाओं की पूर्ति करे और पूर्ण संतोष प्राप्त करे। यह एक सीमित दुनिया है जो केवल व्यक्ति को उसकी आवश्यकताओं को पूरा करने का अवसर देती है ताकि वह अपनी ऊर्जा को ऊँचे आध्यात्मिक उद्देश्य में लगा सके और आख़िरत में अल्लाह के अनन्त इनाम का हक़दार बन सके।

नकारात्मक प्रभाव, सकारात्मक प्रभाव

एक व्यक्ति ने एमबीए की डिग्री प्राप्त की और इसके बाद दिल्ली में एक मल्टीनेशनल कंपनी में अच्छी नौकरी पा ली। उन्होंने इस नौकरी के आधार पर लोन लेकर घर और कार हासिल की। परन्तु कुछ समय बाद वे मुझसे मिले और नाराज़गी भरे लहज़े में बोले कि कंपनी ने उनके एक जूनियर को प्रमोशन दे दिया, जबकि उन्हें नहीं।

मैंने कहा, "इस कंपनी की नौकरी के कारण ही आपको घर और कार मिले। आपने इसका कभी आभार व्यक्त नहीं किया, लेकिन आपका प्रमोशन नहीं हुआ तो आप नाराज़ हो रहे हैं।"

अधिकतर लोगों का स्वभाव यही होता है। वे अपने अनुकूल घटनाओं का उल्लेख नहीं करते, लेकिन उनके विरुद्ध कुछ हो जाए तो उसका खूब चर्चा करते हैं। यह प्रवृत्ति इंसान की मानसिकता को प्रभावित करती है और एक नकारात्मक व्यक्तित्व का निर्माण करती है।

इंसान का स्वभाव यह है कि यदि सौ में निन्यानवे सकारात्मक बातें हों, तो वे उसकी शख्सियत का हिस्सा नहीं बनतीं। लेकिन एक नकारात्मक बात उसकी शख्सियत में पूरी तरह से घुल जाती है। एक गिलास पानी में अगर आप रंग डालें तो वह पूरे पानी में फैल जाएगा। यही मामला इंसान का है। जब वह किसी घटना से नकारात्मक प्रभाव लेता है, तो वह उसकी पूरी शख्सियत में फैल जाता है। इसके विपरीत, कोई सकारात्मक घटना जल्दी से भुला दी जाती है।

लिहाजा, हर व्यक्ति को चाहिए कि वह किसी नकारात्मक प्रभाव का अनुभव करे, तो तुरंत उसे भुला दे, वरना उसकी भारी कीमत उसे नकारात्मक व्यक्तित्व के रूप में चुकानी पड़ेगी।

नफ़रत का बम

हर इंसान के अंदर एक छिपा हुआ शैतान होता है, जिसे नफ़रत का बम (hate bomb) कहा जा सकता है। सामान्य परिस्थितियों में यह बम सोया हुआ रहता है, लेकिन यदि इसे उकसाया जाए, तो अचानक यह उग्र रूप ले लेता है। यह एक वास्तविकता है कि हर इंसान में नफ़रत के इस बम के जगने की संभावना होती है।

इसका अर्थ यह है कि हर व्यक्ति एक अत्यधिक विस्फोटक (highly inflammable) पदार्थ है। यदि किसी समाज में दस हज़ार लोग हैं, तो वे दस हज़ार चलते-फिरते ज्वलनशील पदार्थों का समूह हैं। सामान्य रूप से, यह उनका निजी हित है जो उन्हें शांत बनाए रखता है, भले ही वे स्वभाव से उग्र हों।

इस स्थिति में नेतृत्व करना बहुत कठिन कार्य होता है। यदि किसी नेता के पास केवल शिकायत और विरोध का नारा है, तो उसे सार्वजनिक रूप से सामने नहीं आना चाहिए, क्योंकि उसका नकारात्मक नारा समाज में उथल-पुथल मचाएगा।

एक नेता का यह कर्तव्य है कि यदि उसके पास प्रेम का संदेश है, तो ही वह समाज में अपनी मुहिम लेकर आए। यदि उसके पास केवल नफ़रत और शिकायतें हैं, तो बेहतर यही है कि वह खुद को सीमित रखे।

सामाजिक आंदोलनों के दो प्रकार होते हैं— सकारात्मक आंदोलन और नकारात्मक आंदोलन। सकारात्मक आंदोलन वह है जो कर्तव्य के आधार पर उठाया जाए; यह एक सही आंदोलन होता है। जबकि नकारात्मक आंदोलन वह है जो अधिकारों की माँग और विरोध के आधार पर उठाया जाए; यह एक अस्थिर आंदोलन होता है। सकारात्मक आंदोलन हमेशा अच्छे परिणाम लाता है, और नकारात्मक आंदोलन का अंत हमेशा बुरे परिणामों में होता है।

BOOKS FOR UNDERSTANDING THE SPIRITUAL ESSENCE OF ISLAM

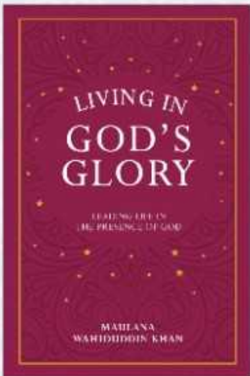

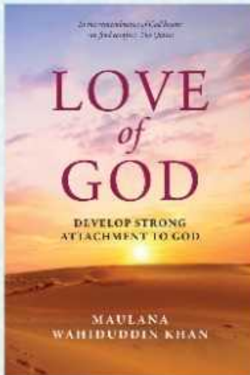

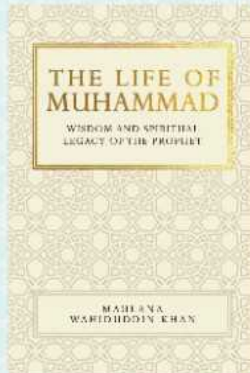

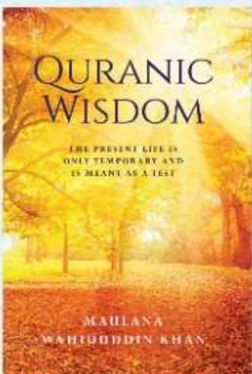

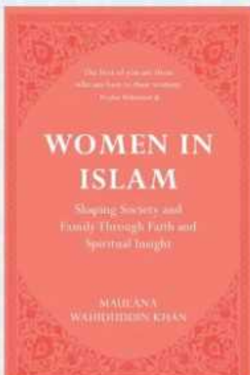

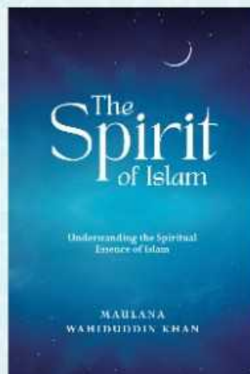

These books provide the general reader with an accurate and comprehensive picture of Islam– the true religion of submission to God.

To order call: 8588822675
sales@goodwordbooks.com

www.goodwordbooks.com

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month
Posted at NDPSO
Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2021-23
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2021-23